حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

جولائی 2018ء
-/30روپے

ISSN-2278-6902

UGC'S Approved Urdu Journal-S.No.41103

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

جناب محمد محمود علی عزت مآب نائب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ سرکاری دفاتر میں میں 36 اردو آفیسرس کے تقرر کے سلسلہ میں منعقدہ امتحان کے نتائج جاری کرتے ہوئے۔
تصویر میں جناب ایم۔ داناکشور سکریٹری اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، جناب شاہنواز قاسم ڈائرکٹر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ و
پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

رانی اندرا دیوی دھن راج گیرجی اور مرحومہ مہرالنساء بیگم (ماہر تعلیم و زوجہ جناب آغا حیدر حسن ادیب)

بیادگار سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۷ ماہ: جولائی سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہدعلی خاں

❁ معتمدعمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِسالانہ

❁ ہندوستان: **300روپے**

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے

قیمت: **-/30**

❁ کتب خانوں سے: **400روپے**

❁ مغربی وعرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت وترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: ***E-mail: idarasabras@yahoo.in***

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

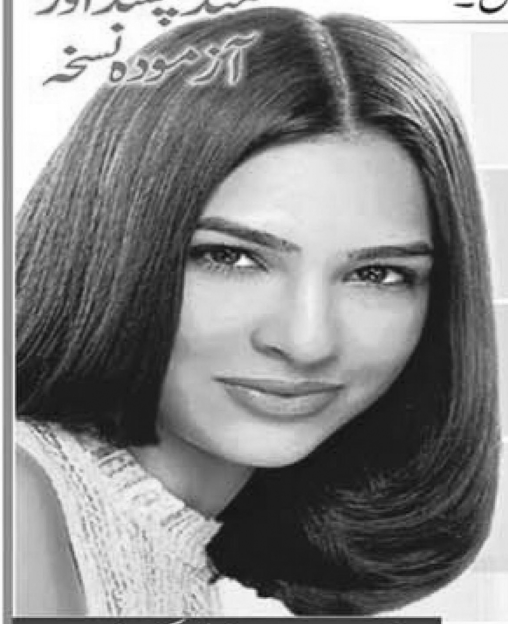

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

نئی اور پرانی نسل کا فرق.....! — بیگ احساس — 6

گوشۂ مشتاق احمد یوسفی

یوسفی طنز و مزاح کا جیتا جاگتا معجزہ تھے..... مجتبیٰ حسین — بیگ احساس — 9

بقلم خود — مشتاق احمد یوسفی — 13

مشتاق احمد یوسفی سے انٹرویو — آصف فرخی — 15

مشتاق احمد یوسفی کی شخصی اور ادبی زندگی — طارق حبیب — 21

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر قصہ پارینہ — سعیدہ بانو احمد — 27

آپ بیتی

یادیں — راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرا — اشرف رفیع — 31

افسانے

نئے موسموں کی دستک — نورالحسنین — 33

واپسی — محمد یحییٰ جمیل — 39

مضامین

صفیہ اختر کے خطوط مشرقی نسائی حسّیت کے آئینہ دار — بی بی رضا خاتون — 46

'ایوانِ غزل' میں حقوقِ نسواں — جاں نثار معین — 51

حامدی کاشمیری کی شعری خدمات — سجاد احمد سلطان — 68

مطالعہ

ماہنامہ ''چہارسو'' (راولپنڈی) کا گوشۂ بیگ احساس — صابر علی سیوانی — 73

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط — ڈاکٹر مسعود جعفری، علیم صبا نویدی، ناہید سلطانہ — 79

اداریہ

نئی اور پرانی نسل کا فرق.....!

بابری مسجد کے انہدام کے بعد بی جے پی جب اقتدار پر قابض ہوئی تو شری اٹل بہاری واجپائی کو وزیر آعظم بنایا گیا۔ ایل کے اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور یشونت سنہا بھی کابینہ میں شامل تھے۔ واجپائی جی کے بارے میں تو کہا جاتا تھا کہ ایک صحیح آدمی غلط پارٹی کا رکن ہے۔ انہوں نے پڑوسی ملک سے تعلقات کو بہتر بنایا تھا۔ جوشی جی الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ یشونت سنہا کانگریس سے آئے تھے۔ ان لوگوں کو ہندوستانی اقدار کا پاس ولحاظ تھا۔ اس میں شک نہیں گجرات میں جو بھیانک نسل کشی ہوئی وہ واجپائی جی کے دور میں ہی ہوئی۔ وہ گجرات گئے بھی تھے اور سخت ناراضگی کا اظہار بھی کیا تھا لیکن گوا میں جو پارٹی کی کانفرنس ہوئی اس میں ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا گیا انھوں نے صرف ''رام راجیہ'' قایم کرنے کی نصیت کر کے اپنا فرض پورا کر دیا۔ کانگریس جب دوبارہ اقتدار پر آئی تو یہ سونیا گاندھی کی قیادت کو سراہا گیا۔ اندیشہ تھا کہ وہی وزیر آعظم کا عہدہ بھی سنبھالیں گی۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت ششما سوراج نے کی تھی۔ حالات کا رُخ دیکھ کر من موہن سنگھ جی کو وزیر آعظم بنایا گیا۔ اب جب دوبارہ بی جے پی نے اقتدار سنبھالا تو وہ مودی جی کا کرشمہ تھا۔ ایسا شخص جس نے کبھی پارلیمنٹ میں قدم نہیں رکھا۔ قسمت کی یاوری سے راست وزیر آعظم بن گیا۔ ہندوستانی جمہوریت میں یہ واحد مثال ہے۔ مودی جی نے جو کابینہ بنائی اس میں انھوں نے بی جے پی کے سینسرار اکین کو حاشیے پر ڈال دیا۔ ایسے لوگوں کو انھوں نے ترجیح دی جو کٹر ہندتوا کے حامی تھے۔ سونے پہ سہاگہ امیت شاہ کو پارٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ اُتر پردیش جیسی بڑی ریاست کے چیف منسٹر یوگی بن گئے۔ مودی جی نے خوب اپنی تشنہ ارزوئیں پوری کیں۔ لباس، غذا اور بیرونی دوروں پر قوم کا کروڑوں روپیہ اندھا دھند صرف کیا۔ ان کے ٹھاٹ کسی بادشاہ سے کم نہیں ہیں۔ اس نئے دور میں جو ہندوستان اُبھر کر سامنے آیا اس میں نوٹ بندی، ہجوم کی وحشیانہ مار پیٹ، بینکوں کے قرض کی عدم ادائیگی، صحافیوں کا قتل، زانیوں کی تائید، لو جہاد، شرعی قوانین میں تبدیلی کی کوشش، ملزمین کی گل پوشی وغیرہ معتارف ہوئے۔ یشونت سنہا اور شترو گھن سنہا بی جے پی سے وابستہ رہے۔ یشونت سنہا نے بی جے پی کو چھوڑ دیا۔ شترو گھن

سنہا بھی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ بی جے پی کی حلیف شیوسینا بھی سخت اختلاف رکھتی ہے۔ سشما سوراج کہنے کو تو وزیر خارجہ ہیں لیکن غیر ملکی دورے خود وزیر اعظم کرتے ہیں۔ سشما جی کا تعلق بھی واجپائی وغیرہ کی نسل سے ہے ان کی تربیت انھیں بزرگوں کے درمیان ہوئی۔ لکھنؤ کے ایک پاسپورٹ سیوا کیندرا کے عہدہ دار وکاس مشرا نے ہندو مسلم جوڑے کی پاسپورٹ کے لیے درخواستیں اس بنا پر مسترد کر دیں کہ انھوں نے بین مذہبی شادی کی ہے۔ پاسپورٹ اُفیسر وکاش مشرا نے خاتون تنوی سے نام بدلنے کو کہا اور ان کے شوہر صدیقی سے مذہب بدلنے کے لیے کہا۔ اس جوڑے نے 19/جون کو پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تھی اور اپائنٹمنٹ کے مطابق 20/جون کو پاسپورٹ آفس گئے تھے۔ سشما سوراج کو اس جوڑے نے ٹوئٹ کیا اور بتایا کہ پاسپورٹ آفیسر نے ہمیں ذلیل اور شرمندہ کیا۔ ان کے مطابق تنوی کا نمبر کاونٹر پر پہلے آیا۔ وکاس شرما نے دستاویزات میں تنوی کے شوہر کا نام انس صدیقی دیکھا تو چلانے لگا اس نے کہا کہ تنوی کو انس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ اتنا چلاّ کر بات کر رہا تھا کہ آس پاس کے لوگ بھی سن رہے تھے۔ تنوی کے ٹوئٹ کے بعد بدسلوکی کے الزام میں وکاس کا فوری اثر کے ساتھ تبادلہ کر دیا گیا۔ تنوی اور اس کے شوہر انس صدیقی کا پاسپورٹ ایک گھنٹے کے اندر جاری کر دیا گیا۔ میڈیا نے وکاس کی تائید میں ایک ہنگامہ مچا دیا۔ سشما جی کے خلاف بدترین گالیاں بھرے ٹوئیٹ کیے گئے۔ ان پر مسلمانوں کی خوشامد کا الزام لگایا گیا۔ سشما سوراج نے بھی کرارا جواب دیا لیکن ان کے مخالفین میں نئی نسل کے لوگ زیادہ ہیں۔ سشما جی نے جو فیصلہ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ ادھر خلیجی ممالک میں گھریلو ملازمت کے لیے گئی ہوئی عورتیں جو اپنے مالکین کے ظلم کا شکار ہو رہی تھیں سشما جی نے انھیں بھی ملک لوٹنے میں مدد کی۔

جموں کشمیر میں محبوب مفتی کی پارٹی نے جو بی جے پی سے گٹھ بندھن کیا تھا اب الیکشن کے سامنے بی جے پی نے یہ بندھن توڑ دیا۔ ریاست میں گورنر راج ہے۔ کشمیر میں میڈیا سے وابستہ شجاعت بخاری کو قتل کر دیا گیا۔ کشمیر کے بی جے پی لیڈر چودھری لال سنگھ نے صحافیوں کو وارننگ دی ہے کہ وہ حد میں رہیں ورنہ ان کا حشر بھی شجاعت بخاری جیسا ہوگا۔ اسی لال چودھری نے کھٹوعہ میں کمسن لڑکی کی عصمت دری اور قتل کیس کے ملزمین کے حق میں ہندو ایکتا منچ کے جلسے میں شریک ہو کر زوردار تقریر کی تھی۔ اس کے بعد بحیثیت ریاستی وزیر انھیں مستعفی ہونا پڑا۔

گوشت کے ایک تاجر علیم الدین انصاری کو مار مار کر ہلاک کیے جانے کے واقعے میں ملوث 11 خاطیوں کو ایک فاسٹ ٹریک کورٹ نے سزائے عمر قید سنائی۔ جھارکھنڈ ہائی کورٹ نے گیارہ کے منجملہ آٹھ خاطیوں کو ضمانت پر رہا کیا۔ جینت سنہا، مرکزی منسٹر آف اسٹیٹ برائے ہوابازی نے جب یہ خاطی ضمانت پر رہا ہو کر جیل سے باہر آئے تو ان کی گل پوشی کر کے مٹھائیاں پیش کیں۔ جینت سنہا، سابق بی جے پی لیڈر یشونت سنہا کے فرزند ہیں۔ یشونت سنہا نے اپنے بیٹے پر سخت تنقید کرتے ہوئے ٹوئٹ کیا۔ اب تک بی جے پی سرکار اس قسم کی حرکتوں سے خود کو بے تعلق بتاتی رہی لیکن حکومت میں شامل وزیر کی خاطیوں کی اس طرح حوصلہ افزائی کرنا یہ ثابت کرتا

ہے کہ موب لینچنگ کے پیچھے یقیناً کسی نہ کسی ''بڑے'' کا آشیرواد ضرور شامل ہوتا ہے۔

بچوں کی چوری کے شبے میں بھیڑ یا مختلف شہروں میں مختلف افراد کو گھیر کر اس قدر پیٹا گیا کہ ان کی موت ہوگئی۔ ایسے واقعات بلاتفریق مذہب وملت مہاراشٹرا، بہار، آسام، حیدرآباد، تری پورہ، جھارکھنڈ اور دوسرے شہروں میں ہوئے۔ جھارکھنڈ میں ایک درجن سے زیادہ موب لینچنگ کے واقعات ہو چکے ہیں۔ یہ رجحان خطرناک ہے۔ اس کی شروعات گجرات کے فسادات سے ہوئی۔ ہزاروں لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہوجاتی ہے پولیس کے لیے بھی اس بھیڑ کو منتشر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہورہا تھا لیکن حکومت خاموش رہی۔ اب جاکے مرکزی حکومت نے عدالت کی مداخلت کے بعد ہدایات جاری کی ہیں کہ ہجوم کے تشدد کو روکنے ریاستیں اقدامات کریں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے پرانی نسل سے زیادہ زہرنئی نسل کے دماغوں میں بھرا ہوا ہے۔ اس نسل کی تربیت ضروری ہے۔ نئی نسل کو ایک ایسا ملک تعمیر کرنا ہے جو مفلسی، بے روزگاری، اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم سے پاک ہو۔ حرص اور لالچ کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ ملک میں کڑوڑوں روپیوں کے اسکام ہورہے ہیں۔ مجرمین نے غیر ممالک میں پناہ لی ہے۔ نئی نسل کو غصہ نہیں آتا۔

ملک کی دولت جو چند گھرانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ سوئیس بینک کی رقومات میں ہندوتان کی جانب سے پچاس فی صد اضافہ ہوا ہے۔ وزیرآعظم نے جو وعدہ کیا تھا اس سے سبھی واقف ہیں۔ یہ برائیاں ملک کو کھوکھلا کررہی ہیں۔ نئی نسل اس جانب توجہ کرے۔ انتخابات سر پر ہیں۔ ملک کی ترقی کے نام پر ووٹ حاصل کرنا بے حد مشکل ہے اس لیے فرقہ وارانہ بنیاد پر نفرت کی سیاست کی جائے گی۔ نئی نسل اچھی طرح سوچ لے کے پارٹیاں اقتدار پر آتی اور جاتی رہیں گی۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے۔ اور ایسی ہر کوشش کو ناکام بنانا ہے اور یہ کام نئی نسل ہی کرسکتی ہے۔ ملک کا مستقبل انھیں کے ہاتھ میں ہے۔

اردو کے لیجنڈ مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کا انتقال 20/جون کو ہوا۔ وہ 95 برس کے تھے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے صرف پانچ مجموعے چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آب گم اور شام شعریاراں ہیں۔ حکومت نے انھیں ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز سے نوازا۔ مشتاق احمد یوسفی کو اردو حلقوں میں اتنی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ موجودہ دور کو ''عہد یوسفی'' سے منسوب کیا گیا۔ ہم ایک چھوٹا سا ''گوشہ'' ترتیب دے کر انھیں خراج عقیدت پیش کررہے ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

بیگ احساس

بیگ احساس

انٹرویو

یوسفی طنز ومزاح کا جیتا جاگتا معجزہ تھے..... مجتبیٰ حسین

سوال: پہلی بار یوسفی صاحب سے کب متعارف ہوئے؟

جواب: 1962ء میں ''چراغ تلے'' شائع ہوا اور اس کی ساری اردو دنیا میں دھوم مچ گئی۔ حیدرآباد میں ایک خاتون کے پاس اس کا ایک نسخہ آیا۔ وہ زبردست سرکیولیشن میں تھا۔ میں نے مزاح لکھنا شروع کر دیا تھا۔ تمام مزاح نگاروں کو پڑھ چکا تھا۔ مشتاق احمد یوسفی کو پڑھنا چاہتا تھا۔ ان خاتون کے روابط سلیمان اریب سے تھے۔ میں سلیمان اریب کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ مجھے وہ کتاب صرف ایک رات کے لیے چاہیے۔ ان دنوں میں محکمہ اطلاعات میں کام کرتا تھا۔ میرے ساتھی عبدالجبار جو اردو کے بہترین ٹائپسٹ تھے ان سے میں نے کہا کہ میں یہ کتاب صرف رات بھر کے لیے مانگ کر لایا ہوں عبدالجبار نے کہا آپ فکر مت کیجئے میں ساری کتاب ٹائپ کر دیتا ہوں۔ رات بھر بیٹھ کر انھوں نے پوری کتاب ٹائپ کی۔ میں نے اطمینان سے کتاب پڑھی، ٹائپ کی غلطیوں کے باوجود مجھے بہت لطف آیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک نیا مزاح نگار طلوع ہوا ہے اس کے آگے مجھے سارے مزاح نگار غروب ہوتے دکھائی دیئے۔ میں نے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں پاکستان کے بیشتر اخبارات میں طنزیہ کالم چھپتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی (عنقا کے نام سے)، ابراہیم جلیس، شوکت تھانوی، مجید لاہوری اور ابن انشا، سب مزاح نگار کالم لکھتے تھے۔ وہ مزاح کا زرّین دور تھا۔ میں سب کو پابندی سے پڑھتا تھا۔ یوسفی نے کالم نہیں لکھے۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا بلکہ مرعوب ہوا۔

سوال: آپ نے انھیں ''زندہ دلانِ حیدرآباد'' کی کسی کانفرنس میں کیوں مدعو نہیں کیا؟

جواب: 1966ء میں طنز ومزاح کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جو سراسر میرے ذہن کی اختراع تھی جس میں ملک بھر کے انتیس (29) مزاح نگاروں نے شرکت کی تھی۔ مخدومؔ نے افتتاح کیا تھا اور کرشن چندر نے صدارت کی تھی۔ اس کے بعد ہندوستان بھر میں طنز ومزاح کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ دلاور افگار کی برصغیر میں بے پناہ شہرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں انھوں نے منظوم خطبہ صدارت پڑھا تھا۔ یوسفی بہت کم لکھتے تھے۔ رسائل میں بھی کم چھپتے تھے۔ جب ان کی دوسری کتاب ''خاکم بدہن'' آئی تو ان کی حیثیت مستحکم ہوئی۔ میں نے بیسوں مرتبہ ان کے مضامین پڑھے۔ اس کے جملے لوگوں کو یاد ہو گئے تھے۔ یوسفی صاحب کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ جلسوں اور محفلوں میں شرکت کرنا پسند نہیں کرتے اس لیے کبھی انھیں مدعو نہیں کیا گیا۔ ورلڈ ہیومر کانفرنس میں بھی پاکستان سے ضمیر جعفری اور عطاالحق قاسمی آئے تھے۔

سوال: یوسفی صاحب سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

جواب: حیدرآبادیوں نے لندن میں ایک تنظیم ''حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن'' بنائی تھی۔ مزاح نگار کی حیثیت سے میری بھی شہرت ہو چکی تھی۔ اس تنظیم کے عہدہ داروں میں میرے پرانے دوست بھی شامل تھے۔ انھوں نے مجھے اپریل 1984ء میں لندن بلایا۔ اس سے قبل میں حکومت کی جانب سے 1980ء میں جاپان جا چکا تھا۔ لندن مجھے پہلی بار مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یوسفی صاحب وہاں Bank of Commerce & Credit International میں

ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ یوسفی صاحب کی دلچسپی سے لندن میں اردو مرکز قائم ہوا تھا۔افتخار عارف اس کے سربراہ تھے۔افتخار عارف سے ہندوستان میں کئی ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ میں نے اپنے دوستوں اورافتخار عارف سے کہا میرا جلسہ بھلے ہی نہ رکھو۔ مجھے یوسفی صاحب سے ملوا دو۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔لندن آئے ہوئے چوتھا دن تھا۔صبح میں بستر ہی میں تھا کہ افتخار عارف کا فون آیا۔ یوسفی صاحب نے تمھیں کھانے پر بلایا ہے۔کل کی شام خالی رکھو۔ابھی میں بستر سے اٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا۔ یوسفی صاحب کا فون آیا۔ان سے فون پر جو مختصر گفتگو ہوئی مجھے اس کا ایک ایک لفظ یاد ہے خاص طور پر جب میں نے ان سے کہا کہ ''آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے'' بولے یہ اشتیاق یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے میں بھی آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں''۔ میں نے کہا''آپ تو صرف مشتاق ہیں میں تو سراسر مشتاق احمد یوسفی ہوں'' میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ انھوں نے کھانے پر بلایا تھا۔ میرے لیے جو محفل منعقد کی گئی تھی اس میں بھی خاص طور پر شریک ہوئے۔ یوں تعلقات استوار ہوئے۔ لندن میں کئی ملاقاتیں ہوئیں جس کا ذکر میں اپنی تحریروں میں کر چکا ہوں۔ مجھے ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہ لوگوں سے ملتے نہیں تھے کم آمیز اور کم گو تھے۔ادبی محفلوں میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔

سوال: اس کے بعد بھی آپ نے ان سے ربط رکھا؟

جواب: وہ خط و کتابت نہیں کرتے تھے۔میری مشفق خواجہ اور ضمیر جعفری سے خط و کتابت تھی۔ان سے یوسفی صاحب کے بارے میں پوچھ لیا کرتا تھا۔وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ پاکستانی اردو دوستوں نے 1997ء میں شارجہ میں جشن یوسفی منانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے خود شرکت سے انکار کر دیا اور میرے نام کی سفارش کی اور کہا کہ مجتبیٰ حسین کا جشن منایئے۔ چناں چہ شارجہ میں جشن مجتبیٰ حسین شان و شوکت سے منایا گیا۔ پاکستان کے کئی مزاح نگاروں نے شرکت کی۔اس جشن کے منتظمین کی یہ ادا مجھے پسند آئی کہ انھوں نے اپنے سووینیر کے اداریئے میں لکھا کہ جب یوسفی نے مجتبیٰ حسین کا نام تجویز کیا تو ہمیں خود ان کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ یہ جشن بے حد کامیاب رہا جس میں ساڑھے تین ہزار ہندوستانی اور پاکستانی افراد نے شرکت کی۔

سوال: مشتاق احمد یوسفی غالباً واحد مزاح نگار ہیں جنھوں نے مزاحیہ انداز میں اپنی خودنوشت لکھی۔

جواب: آپ کا خیال صحیح ہے۔ یہ واحد مزاحیہ سرگزشت ہے۔ یہ ایک لاجواب سوانح عمری ہے۔جس میں انھوں نے تقسیم ہند سے لے کر بینک کی ملازمت تک کے واقعات لکھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کن نامساعد حالات میں اپنی زندگی گزاری۔

سوال: یوسفی کی تحریریں خواص کے لیے ہیں۔ جب تک قاری اردو ادب کی تاریخ سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا ان کی تحریر سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ جگہ جگہ حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں۔پھر ان کی عوام میں مقبولیت کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یوسفی بڑے اہتمام سے لکھتے تھے شاید ہی کسی مزاح نگار نے اتنے منظم انداز میں لکھا ہو۔ایک ایک جملے کو دس دس بار لکھتے تھے۔ کچھ دن رکھ دیتے تھے اس کے بعد دوبارہ پڑھتے تھے اور مناسب تبدیلیاں کرتے تھے۔ نہ صرف وہ لفظوں کا بلکہ فل اسٹاپ اور کاما کا تک خیال رکھتے تھے۔ یوسفی کی تحریروں میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے وہ گہری سوچ بچار اور غور و خوص کا نتیجہ ہیں۔ ایسا زیرک اور چوکس مزاح نگار اردو ادب میں کوئی اور نہیں ہے۔

سوال: میں نے عوام میں مقبولیت کی وجہ پوچھی تھی؟

جواب: یوسفی کا اسلوب آسان نہیں ہے۔ وہ بہت ہی سنجیدہ قرأت کا مطالبہ کرتا ہے۔ یوسفی کے اندر علم کا خزانہ تھا۔ وہ نہ صرف اردو، بلکہ گجراتی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ ان کے جملوں کی ساخت کچھ ایسی ہوتی تھی کہ سیدھے دل پر اثر کرتی تھی۔ ہر پیراگراف بار بار پڑھنے کے بعد ہی صحیح لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر جملے اقوال کے روپ میں یاد رکھے جاتے ہیں۔ خواص کے علاوہ عوام کی دلچسپی کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔

سوال: وہ اشعار میں تحریف اور پیروڈی سے بھی لطف پیدا کرتے تھے۔

جواب: انھیں زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ابراہیم جلیس اور ابن انشا کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بے ساختہ اور بے تکان لکھتے تھے۔ برسبیل تذکرہ یاد آیا کہ ابتدائی زمانے میں ان کی دو کتابیں پڑھ کر میں نے کہا تھا یوسفی کے فن کا کمال یہ ہے کہ آپ پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کو الگ الگ پڑھنے سے بچ جاتے ہیں کیوں کہ مشتاق احمد یوسفی، پطرس اور رشید احمد صدیقی کا حسین امتزاج ہیں۔ لیکن یوسفی ایک منفرد مزاح نگار ہیں۔ اصل میں ہم لوگ بت پرستی اور ماضی پرستی سے پیچھا نہیں چھڑا سکے اس لیے ادب کے ایوانوں سے بتوں کو ہٹانے کے قائل نہیں ہیں۔

سوال: یوسفی صاحب پہلے تو اپنی تحریر پر خود ہی غور وخوص کرتے تھے۔ پھر کسی اہل زبان جیسے شان الحق حقّی، شاہد احمد دہلوی، ضیاالدین احمد شکیب اور اپنی بیوی کو اپنی تحریر دکھاتے تھے۔ یہ خود اعتمادی کی کمی ہے یا وہ Perfectionist تھے؟

جواب: ظاہر ہے وہ Perfectionist ہیں۔ مذکر، مونث، قواعد کی کوئی بھی غلطی اور لفظ کے بے محل استعمال سے وہ بچنا چاہتے تھے۔

سوال: دوسرے مزاح نگاروں کی طرح انھوں نے اپنی بیگم کو کبھی مذاق کا نشانہ نہیں بنایا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یوسفی صاحب کی بیگم بے حد پڑھی لکھی اور اہل زبان خاتون تھیں۔ ان کی تحریروں کی پہلی قاری وہی ہوتی تھیں۔ یوسفی صاحب ان کے انتقال کے بعد کچھ بجھ سے گئے تھے۔

سوال: اردو میں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی نے مزاحیہ ناول لکھے اس کے برخلاف یوسفی صاحب ''آب گم'' کو Fact + Fiction یعنی Faction کا نام دیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

جواب: ظاہر ہے ''آب گم'' کو خالص ناول نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں حقیقی کردار ہیں۔

سوال: یوسفی صاحب نے دوسرے مزاح نگاروں کی طرح خاکے نہیں لکھے اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

جواب: الگ سے خاکے نہیں لکھے لیکن ''زرگزشت'' میں اینڈرسن اور سیف الملوک کا جو نقشہ کھینچا وہ بے مثال خاکے ہی ہیں۔

سوال: غالبؔ کے متروک کلام سے بعض ایسے اشعار دریافت ہوئے جو بے حد مشہور ہوئے۔ لیکن یوسفی کی متروک تحریریں جب ''شام شعر یاراں'' کے نام سے شائع ہوئیں تو اسے وہ مقبولیت نہیں ملی۔ کیا یہ شعر ونثر کا فرق ہے۔

جواب: یوسفی صاحب نے پہلے تو ''شام شعر یاراں'' کی اشاعت کی اجازت تو دی لیکن بعد میں اس سے دست برداری حاصل کر لی۔ اس میں Fact ہی Fact ہے تخیل نہیں ہے۔ بعض جملے چونکاتے ضرور ہیں لیکن اس میں وہ کساؤ نہیں ہے جو یوسفی کی تحریروں کا نمایاں وصف ہے۔

سوال: یوسفی صاحب کا مزاح خالصتاً ''اردو ادب اور معاشرے کی پیداوار ہے دوسری زبانوں میں کا ان کا ترجمہ ممکن نہیں ہے؟

جواب: ''دھرم یگ'' کے ایڈیٹر دھرم ویر بھارتی ہندی کے بہت ہی نامی گرامی تخلیق کار تھے انھوں نے اردو کے بعض اہم ادیبوں

جیسے کرشن چندر بیدی، عصمت، قرۃ العین حیدر اور خاکسار کی تحریروں کا ترجمہ ہندی میں کروایا۔ انھوں نے اپنے اسٹاف ممبر لکشمی چندر گپتا کو یہ کام سونپا جو اردو ہی نہیں بلکہ فارسی اور عربی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ دھرم ویر بھارتی نے انھیں جب یوسفی کی تحریروں کا ترجمہ کرنے کو کہا تو لکشمی چندر گپتا جو میرے گہرے دوست بھی تھے مجھ بتایا کہ یوسفی کی تحریر کو ہندی میں منتقل کرنا ناکوں چنے چبانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے ترجمہ کیا۔ دھرم یگ میں کچھ مضامین چھپے لیکن وہ تاثر پیدا نہ ہوسکا۔

سوال: یوسفی صاحب کبھی ہندوستان کیوں نہیں آئے۔ آپ نے انھیں حیدرآباد کیوں مدعو نہیں کیا؟

جواب: انھوں نے مجھ سے حیدرآباد آنے کا وعدہ کیا تھا مگر اس وقت وہ بینک کے جس اونچے عہدے پر فائز تھے اس سے مجھے اندیشہ تھا کہ وہ ان ساری ذمہ داریوں کے درمیان سے وقت نہیں نکال سکیں گے۔ ویسے بھی وہ سفر سے گریز کرتے تھے۔

سوال: ''آبِ گم'' میں حیدرآباد کا ذکر ملتا ہے کہ کس طرح یہاں کے لوگ گھروں کے باہر دروازے پر کھڑے ہوکر تالی بجاتے اور صاحب خانہ کا نام لے کر اونچی آواز میں پکارتے تھے۔

جواب: اگرچہ وہ علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے لیکن حیدرآباد کی تہذیب معاشرہ اور مشاہیر کے بارے میں بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ نے اردو کو علمی زبان بنانے میں جو اہم خدمات انجام دیں اس کے بے حد معترف تھے۔ انھوں نے مجھ سے حیدرآبادی زبان کے لفظوں اور محاوروں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس سے ان کی لسانی جستجو کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سوال: کیا صنف نازک کے لیے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے؟

جواب: حیدرآباد کی دو اسکالروں، پروفیسر میمونہ وحید اور ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے ان پر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مجھ سے ربط پیدا کیا۔ میں نے ان کا فون نمبر دیا جو بہت کم کسی کو دیتے تھے۔ ان خواتین نے جب بھی ان سے فون پر بات کی یوسفی صاحب نے ان کی پذیرائی کی تفصیلی گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریر میں کہیں کہیں شوخی بھی جھلکتی ہے۔

سوال: یوسفی صاحب ایک عرصے سے علیل تھے۔ ایک اندیشہ تو تھا کہ پتہ نہیں کب کیا ہوجائے۔ آپ کو ان کے انتقال کی خبر سن کر کیسا لگا؟

جواب: ہمیشہ ایک دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بری خبر نہ آجائے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل کراچی کی عالمی اردو کانفرنس میں ''جشن ادب'' کے سربراہ ومشہور شاعر جنیش چوہان نے کراچی میں ان سے ملاقات کی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم یوسفی صاحب تک کیسے پہنچے۔ انھوں نے بتایا کہ یوسفی صاحب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب بھی وہ گئے دو منٹ کے لیے سہی ان سے ملاقات ضرور کی۔ انھوں نے بتایا کہ یوسفی صاحب نے نہ صرف میرے بارے میں دریافت کیا بلکہ یہ بھی پوچھا کہ ان کی کوئی نئی کتاب بھی آئی ہے۔ مجھے جب انتقال کی خبر ملی تو ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود مجھ پر ایک سکتہ سا طاری ہوگیا۔ یوسفی کا گزر جانا طنز ومزاح کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ان کے جانے کا دکھ اب بھی اپنے وجود میں محسوس کرتا ہوں۔ ان کی تحریریں جس طرح دیرپا اثر رکھتی ہیں ان کا دکھ بھی وہی تاثیر رکھتا ہے۔ وہ ایک بے مثال مزاح نگار تھے۔ میرا خیال ہے یوسفی طنز و مزاح کا ایک جیتا جاگتا معجزہ تھے ان کے جیسا مزاح نگار اردو ادب میں نہ پہلے کبھی پیدا ہوا اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہوگا۔

☆☆☆

مشتاق احمد یوسفی

بقلم خود

☆ نام

مشتاق احمد یوسفی

☆ خاندان

سو پشت سے پیشہ آبائ سپہ گری کے سوا سب کچھ رہا ہے

☆ تاریخ پیدائش

عمر کی اس منزل پر آ پہنچا ہوں کہ اگر کوئی سن ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگا لیتا ہوں۔

اور یہ منزل بھی عجیب ہے۔ بقول صاحب ''کشکول'' ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف بہو بیٹی قسم کی خواتین سے اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔فلاں کے بھانجے ہیں اور اب یہ زمانہ آ گیا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے ماموں۔اور ابھی کیا گیا ہے۔عمر رسیدہ پیش رو زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس کے آگے مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں۔

☆ پیشہ

گو کہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اول آیا، لیکن سکول میں حساب سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔اور حساب میں فیل ہونے کو ایک عرصے تک اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتا رہا۔

اب وہی ذریعہ معاش ہے۔حساب کتاب میں اصولاً دو اور دو چار کا قائل ہوں۔مگر تاجروں کی دل سے عزت کرتا ہوں کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے دو اور دو کو پانچ کر لیتے ہیں۔

☆ پہچان

قد: پانچ فٹ ساڑھے چھ انچ (جوتے پہن کر)

وزن: اوور کوٹ پہن کر بھی دبلا دکھائی دیتا ہوں۔ عرے سے مثالی صحت رکھتا ہوں۔اس لحاظ سے کہ جب لوگوں کو کراچی کی آب وہوا کو برا ثابت کرنا مقصود ہو تو اتمام حجت کے لیے میری مثال دیتے ہیں۔

جسامت: یوں سانس روک لوں تو ۳۸ انچ کا بنیان بھی پہن سکتا ہوں۔بڑے لڑکے کے جوتے کا نمبر ے ہے جو میرے بھی فٹ آتا ہے۔

حلیہ: اپنے آپ پر پڑا ہوں۔

پیشانی اور سر کی حد فاصل اڑ چکی ہے۔لہٰذا منہ دھوتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ناک میں بذاتہ قطعی کوئی نقص نہیں مگر بعض دوستوں کا خیال ہے کہ بہت چھوٹے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔

☆ پسند

غالب، باکس بے، بھنڈی

پھولوں میں، رنگ کے لحاظ سے، سفید گلاب اور خوشبوؤں میں نئے کرنسی نوٹ کی خوشبو بہت مرغوب ہے۔میرا خیال ہے کہ سرسبز تازہ تازہ اور کرارے کرنسی نوٹ کا عطر نکال کر ملازمت پیشہ حضرات اور اون ان کی بیویوں کو مہینے کی آخری تاریخوں میں سنگھایا جائے تو گرہستی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔

پالتو جانوروں میں کتوں سے پیار ہے۔ پہلا کتا چوکیداری کے لیے پالا تھا۔اسے کوئی چرا کر لے گیا۔اب محض بر بنائے وضع داری پالتا ہوں کہ انسان کتے کا بہترین رفیق ہے۔ بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتوں سے بلا وجہ چڑتے ہیں حالاں کہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود

ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہی ہیں۔ اور وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔ گانے سے بھی عشق ہے۔ اسی وجہ سے ریڈیو نہیں سنتا۔

☆ چڑ

جذباتی مرد، جذباتی عورتیں، مٹھاس، شطرنج

☆ مشاغل

فوٹو گرافی، لکھنا پڑھنا

☆ تصانیف

چند تصویر بتاں، چند مضامین و خطوط

کیوں لکھتا ہوں

ڈزریلی نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جب میرا جی عمدہ تحریر پڑھنے کو چاہتا ہے تو ایک کتاب لکھ ڈالتا ہوں۔ رہا یہ سوال کہ یہ کھٹ مٹھے مضامین طنزیہ ہیں یا مزاحیہ یا اس سے بھی ایک قدم آگے..... یعنی صرف مضامین، تو یہاں صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ وار ذرا اوچھا پڑے، یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے گی تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ مزاح ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے۔

اور جہاں یہ صورت ہو تو خام فنکار کے لیے ایک طنز ایک مقدس جھنجھلاہٹ کا اظہار بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ لکھنے والا جو سماجی اور معاشی ناہمواریوں کو دیکھتے ہی دماغی باولے میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، خود کو طنز نگار کہنے اور کہلانے کا سزا وار سمجھتا ہے لیکن سادہ و پر کار طنز ہے۔ بڑی جان جوکھوں کا کام۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسے پر اترا اترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ ''رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر''

اور اگر ژاں پال سارتر کی مانند ''دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک'' ہو تو جہنم جہنم کی یہ جھنجھلاہٹ آخر کار ہر بڑی چیز کو چھوٹی کر دکھانے کا ہنر بن جاتی ہے۔ لیکن یہی زہر غم جب رگ و پے میں سرایت کر کے لہو کو کچھ اور تیز و تند و توانا کر دے تو نس نس سے مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عمل مزاح اپنے لہو کی آگ کی تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس ننھے سے چراغ سے نہ کوئی الاؤ بھڑک سکا اور نہ کوئی چتا و ہکی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اپنی چاک دامنی پر جب اور جہاں ہنسنے کو جی چاہا ہنس دیا۔ اور اب اگر آپ کو بھی ہنسی میں شامل کر لیا تو اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہنسنے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ پھر وہ اتنے برے نہیں معلوم ہوتے۔ بالفعل، اس سے بھی غرض نہیں کہ اس خند مکرر سے میرے سوا کسی اور کی اصلاح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ ہنسنے کی آزادی فی نفسہ تقریر کی آزادی سے کہیں زیادہ مقدم و مقدس ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ پر جی کھول کر ہنس سکتی وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتی۔ یقین کیجئے، اس سے اپنے علاوہ کسی اور کی اصلاح و فہمائش مقصود ہو تو روسیاہ۔ کارلائل نے دوسروں کی اصلاح سے غلو رکھنے والوں کو بہت اچھی نصیحت کی تھی کہ ''بڑا کام یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی اصلاح کر لے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا سے کم از کم ایک بدمعاش تو کم ہوا'' میری رائے میں (جو ضروری نہیں کہ ناقص ہی ہو) جس شخص کو پہلا پتھر پھینکتے وقت اپنا سر یاد نہیں رہتا، اسے دوسروں پر پتھر پھینکنے کا حق نہیں۔

(پہلا پتھر۔ چراغ تلے)

☆☆☆

انٹرویو

مشتاق احمد یوسفی سے انٹرویو

سوال: کرنل محمد خان نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی ہے اور عموماً ایسی باتیں انٹرویو میں ہی کہی جاتی ہیں کہ بہت سے لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے ہیں اور ان میں سے کئی مایوس ہو کر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ جس قسم کی تیزی اور طراری اور شوخی اور چونچالی کرنل صاحب کی تحریر میں ہے، تو ان کی گفتگو بھی کچھ اسی قسم کی ہوگی کہ سمجھئے باتوں میں پھلجڑیاں چھوٹ رہی ہوں گی اور جب ان لوگوں کا سامنا گوشت پوست کے ایک آدمی سے ہوتا ہے جو کبھی دلچسپ باتیں کرتا اور کبھی اس کی طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوتی تو وہ کچھ مایوس ہو کر جاتے ہیں تو طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کیا آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ لوگ اور ان میں انٹرویو کے خواہش مند افراد بھی شامل ہیں ایسی توقعات لے کر آتے ہیں کہ گویا وہ چراغ تلے اور زرگزشت کا چلتا پھرتا اور متکلم نمونہ ایک شخص کی صورت میں پائیں گے۔

یوسفی: درست ہے آپ کا یہ خیال، اس لیے کہ بیشتر پڑھنے والوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مزاح نگار جیسا کچھ اپنے کرداروں کی صورت میں نظر آتا ہے کتاب میں ویسا ہی وہ خود بھی ہوگا۔ مگر ایسا ہوتا نہیں کبھی۔ یہ غالباً ''ڈان کیہوٹے'' کے مصنف کا لطیفہ ہے کہ وہ ایک محفل میں گیا اور وہاں ایک ایڈمرل صاحب تھے انہوں نے یہی بات کافی دیر ان کی گفتگو کا انتظار کر کے کہی۔ انہوں نے کہا کہ صاحب بڑی مایوسی ہوئی آپ سے مل کر اس لیے کہ ظاہر ہے کہ کتاب میں شگفتگی ہے شروع سے آخر تک اس نے بڑا معقول جواب دیا۔ اس نے کہا کہ دیکھئے اتنی دیر سے آپ بھی بیٹھے ہیں اور میں بھی بیٹھا ہوں، میں نے آپ سے توپ چلانے کے لیے تو نہیں کہا جو آپ کے فرائض میں داخل ہے تو آپ مجھ سے یہ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ میں یہاں پر پھلجھڑیاں چھوڑوں گا تو کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے کہ لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ کوئی بہت ہی بذلہ سنج آدمی اپنی صحبت میں بھی ہوگا۔ ایسا ہوتا نہیں اور جن Cases میں ہوتا ہے ان کی نوعیت دوسری ہوتی ہے اور وہ بہت نادر ہیں۔ مثلاً شوکت تھانوی صاحب تھے ان میں البتہ یہ خوبی تھی کہ تحریر سے کہیں زیادہ دلچسپ اور شگفتہ وہ صحبت میں ہوتے تھے ان سے بہتر MINIC کوئی ملنا دشوار تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مصنف سے ملنے کی بہترین صورت جو ہے وہ Covers کے درمیان ہے اور پھر اگر گوشت پوست کے مصنف سے آپ مل رہے ہیں تو پھر آپ کتاب کو بھول جائیے۔ پھر ایک دوسری شکل آپ کے سامنے ہے اس کی پذیرائی پھر آپ پر لازم ہے، جیسا کچھ بھی وہ ہے۔

سوال: شوکت تھانوی کا آپ نے ذکر کیا تو ان کے بعض دوسرے لوگوں کے بارے میں یہ بات بہت آسانی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اپنی ذکاوت اور بذلہ سنجی کو اپنی گفتگو میں اس طرح بے دریغ لٹای کہ اپنا تحریر میں وہ بات پیدا نہ کر سکے۔ آسکر وائلڈ کے بارے میں آندرے ژید نے کہا ہے کہ اس نے اپنا ٹیلنٹ اپنی تحریر میں صرف کیا اور اپنا جینیس اپنی زندگی میں کہیں ایسا تو نہیں آپ کی احتیاط پسندی آپ کو ایسی صورت حال سے محفوظ رہنے کی یہ راہ سمجھا رہی ہو؟

یوسفی: دیکھئے صورت یہ ہے کہ ہر آدمی کے پاس ذہانت کا اور بذلہ سنجی کا اور ایک لحاظ ہے اگر وہ طنز نگار ہے یا مزاح نگار ہے تو تلخی کا یا کونین کا ایک محدود سرمایہ ہوتا ہے کسی کے پاس کم، کسی کے پاس

زیادہ، یہ دوسرا سوال ہے۔لیکن فرض کیجئے کہ ایک دوقطرے کونین کے آپ ایک گلاس میں ڈال دیں تو پورا گلاس کڑوا ہو جائے گا لیکن وہی کونین کے دوقطرے آپ کسی بہت بڑے حوض میں ڈال دیں تو اس کا پتہ بھی نہ چلے گا۔لہٰذا بہت سے مصنف ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو dilute کرتے رہتے ہیں مستقل کہ جب کہنے کی بات نہیں رہی، جو کہنے کی بات تھی وہ کہہ چکے اس کے بعد بھی کہے چلے جارہے تو پھر کوئی بات بنتی نہیں۔اس لیے کوئی نام لینے کی چنداں ضرورت نہیں اور میرے ذہن میں اس وقت معاصرین ہیں بھی نہیں،''مگر یہ ''اودھ پنچ'' کے جو لکھنے والے تھے لکھنو سے جو نکلتا تھا اس کے لکھنے والوں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں خاص طور سے ان کی ساری ظرافت اور ساری برجستگی اور ساری شگفتگی جو تھی وہ صرف الفاظ کے گرد گھومتی تھی۔ اس میں کوئی خیال یا کوئی Situation یا کوئی جذبہ آپ کو اس کے پیچھے نظر نہیں آتا۔وہ الفاظ کا نیا گرا تھی جیسے بچے Lago یا میکانو کے سیٹ سے مختلف چیزیں بناتے رہتے ہیں اسی طریقے سے وہ الفاظ سے کھیلتے رہتے ہیں۔چنانچہ ان کا مزاح جو ہے وہ ایک بہت ہی سطحی قسم کا اور وقتی قسم کا مزاح رہا ہے اس لیے ان کی پیشانی پر آپ سوچ کی کوئی لکیر نہیں دیکھیں گے میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مزاح کہ جو آپ کو سوچنے مجبور نہ کرے وہ ناپختہ ہے۔

سوال: یوسفی صاحب! آپ نے دو قسم کے مزاح میں تفریق کی۔ مزاح کا ایک انداز وہ ہے کہ جو مضحک Situation یا واقعات کے سلسلہ سے قارئین میں تفنن طبع پیدا کرتا ہے۔دوسرا مزاح وہ ہے جو سوچنے پر اکساتا ہے میرا یہ خیال ہے کہ ہمارے ہاں مزاح کا ایک انداز تو وہ رہا کہ جیسے آپ نے اودھ پنچ کا ذکر کیا، یا پھر کھلنڈرے رومانی ہیرو کے بارے میں جو افسانے لکھے گئے، جب کہ آپ کے مزاح کا ڈھنگ دوسرا ہے یہ مزاح جو کبھی تکلیف بھی دیتا ہے، سوچنے پر بھی اکساتا ہے۔

یوسفی: جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تفکر کو اور تفنن کو میں یکجا دیکھنا چاہتا ہوں۔کوئی ایسی situation جس میں محض Horse-play ہو اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور آج کل ایک بات خاص جو نئی ابھری ہے خصوصاً مغرب میں کہ مزاح لکھنے والے اب تقریباً ناپید ہو گئے ہیں، مغرب میں میں پہلے کبھی کسی انٹرویو میں ذکر کر چکا تھا کہ جارج میکش نے جو اس دور کا سب سے بڑا مزاح لکھنے والا تھا، اس نے میرے خیال میں بیس سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی Jest in Memorium اور اس میں اس نے اسی بات کا تجزیہ کیا تھا کہ مغرب میں مزاح مر کیوں گیا۔تو جہاں تک مغرب کا تعلق ہے تو اب اس میں نئے مزاح لکھنے والے پیدا نہیں ہو رہے ہیں قد آور قسم کے ہمارے یہاں البتہ ایک کھیپ آئی ایک دم اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مزاح نگاری کا یہ ایک سنہری دور تھا۔جس میں شفیق الرحمان تھے اور تھے کیا ہیں، کرنل محمد خان، ضمیر جعفری، محمد خالد اختر اور سرفہرست ابن انشاء اور ہندوستان میں مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم ہیں اور رشید احمد صدیقی اور پطرس تو ان سے پہلے ہی ہیں۔لیکن یہ جتنے نام میں نے آپ کو گنوائے ان میں پطرس اور رشید احمد صدیقی اور ابن انشاء یہ تو مرحوم ہوئے اور باقی کے جتنے نام ہیں ان میں غالباً مجتبیٰ حسین کو چھوڑ کر کسی لکھنے والے کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہے۔تو جہاں یہ بات بہت ہی فرحت ناک ہے کہ اتنے قد آور لکھنے والے ایک ساتھ ابھرے اردو کے افق پر، وہاں یہ چیز تکلیف دہ بھی ہے کہ ان کے بعد کی جو صف ہے اس میں ایسے قد و قامت کے لوگ فی الحال ابھرتے ہوئے نظر نہیں آتے ممکن ہے کہ جو معاشرے کا مزاج ہے مغرب میں اسی کے لحاظ سے ہمارے ہاں بھی کچھ تبدیلیاں آئی

ہوں ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے خیال میں ہمارا معاشرہ طنز نگار اور مزاح نگار دونوں کے لیے مواقع اور خام مواد وافر مقدار میں فراہم کرتا ہے۔

یوسفی: اس وقت تو بہت ہے لکھنے والے کے لیے وہ تو بکھرا پڑا ہے چاروں طرف ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی معاشرہ نہیں بلکہ ہر معاشرہ مواد فراہم کرتا ہے لکھنے والے کو جتنا وہ لکھنا چاہے۔لیکن ایک ایسا معاشرہ کہ جس کے مسائل اتنے گمبھیر ہوں اور جس میں اتنے تضادات ہوں اور جو اتنا Corrupt ہو گیا تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا کوئی سا بھی سرا آپ اٹھا لیں تو اس میں آپ جتنا چاہیں اس کی نقاب کشائی کرتے چلے جائیں۔

سوال: میرے سوال کا یہی مقصد تھا کہ ایسا معاشرہ کہ جس میں رواداری اور برداشت کم ہوتی چلی جا رہی ہوں اور مقدس گائیں یا Sacred Cows کی جن پر ہنسنے کی اجازت نہیں ہے۔ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو ایسے معاشرے میں مزاح لکھنے کے لیے قلم اٹھانا کئی طرح کے پیشہ وارانہ خطرات کا حامل نظر آتا ہے اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ابھی یہ بھی فرمایا کہ اب اس قسم کے جید لکھنے والے تھے مزاح کے میدان میں تو اب ان کی جگہ لینے کے لیے نئے لکھنے والے اس تعداد میں یا اس معیار کے مطابق سامنے نہیں آ رہے۔تو کیا ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی تعلق ہے؟ کہیں یہ تعلق سبب کا تعلق تو نہیں؟

یوسفی: میں سمجھتا ہوں کہ جو فرق ہمیں پچھلی نسل اور موجودہ نسل میں محسوس ہوتا ہے، کچھ خاص شعبوں میں، وہی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کم و بیش محسوس ہوتا ہے مگر ایسا ہے کہ راہ مضمون تازہ کبھی بند نہیں ہوتی اور یہ سمجھنا کہ اب کوئی اچھے لکھنے والے نہ آئیں گے، یہ بالکل غلط ہے۔اس سے بھی بہتر لکھنے والے آئیں گے اور اسی سے دنیا قایم ہے۔لہٰذا اس کے متعلق کوئی پیش گوئی کرنا بے معنی ہوگا۔صرف موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قد و قامت کے لوگ نکل نہیں رہے، نکلیں گے ضرور۔

سوال: اچھا، مثلاً کون سے مصنف آپ کو پسند ہیں؟

یوسفی: مثلاً مارک ٹوئین جو باوا آدم ہیں مزاح نگاری کے۔ سوئفٹ، وہ اتنے Humorist نہیں کہ جتنے Satirist ہیں۔اسٹیفن لی کاک پھر جارج مکیش اور ادھر مصنفین میں جیمز جوئس اور پھر انتھونی برجیس ان میں سے اگر یہ لفظ ہی استعمال کیا جائے تو ان سے Influenced ہوا ہوں۔اگر پوچھا جائے کہ کس سے Influenced ہوا تو ان کا نام لوں گا ایک زمانے میں مجھ پر لارنس ڈرل بھی بہت سوار رہا تھا اور کبھی کبھی مجھے اس چیز سے ضرور مایوسی ہوتی ہے کہ لوگ میری تحریروں میں حقیقی یا فرضی پرچھائیاں، کبھی رشید احمد صدیقی کی یا کبھی پطرس کی ان کو دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن جو میرے اصل ماخذ ہیں ان کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں گئی۔

سوال: مغرب میں طنز و مزاح کو ادب کی ایک الگ صنف سمجھنے کے بجائے ناول اور افسانے میں اس کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ممکن ہے کہ مزاح نگاری میں کم لوگوں کے سامنے آنے کا جو آپ نے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہی ہو۔

یوسفی: جی ہاں، صحیح ہے میں نے کہیں کہا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ہر چیز میں حل ہو جاتی ہے۔ مذہب، الکحل اور مزاح۔ یہ آپ جس چیز کے ساتھ چاہیں بڑی آسانی سے انہیں ملا سکتے ہیں Mix up کر سکتے ہیں۔مختلف تجربے بڑے دلچسپ ہوتے رہے ہیں۔

سوال: ان تینوں چیزوں میں اس کے علاوہ بھی کوئی مماثلت آپ کو نظر آتی ہے۔

یوسفی: اور تو بظاہر نہیں ہے۔ ایک البتہ مماثلت آپ کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے ایک جگہ کہا ہے ''بے نشہ کس کو طاقت آشوب آگہی'' اور یہ اتنا اچھا مصرعہ اتنا جامع اور مکمل مصرعہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرعہ نہ میں نے کبھی یاد کرنے کی کوشش کی اور نہ مجھے اس کا ملال کہ مجھے اس کا دوسرا مصرعہ یاد نہیں۔ بات غالب یہ کہتا ہے کہ آشوب آگہی جو ہے عقل کا جوفتور ہے اور عقل جس آزمائش اور عذاب میں انسان کو ڈالتی ہے اس کے مقابلے کے لیے کسی نشے کی ضرورت ہے۔ اس آشوب آگہی کا مقابلہ بغیر کسی نشے کے کر نہیں سکتا۔ اب اس نشے کی مختلف شکلیں ہیں جس کو جو نشہ راس آئے اور موافق آئے مثلاً کہ کسی کو تصوف راس آ گیا، کسی نے جنس میں پناہ لی تو یہ تینوں چیزیں جو میں نے گنائیں آپ کو مذہب، الکحل اور مزاح، یہ تینوں پناہ گاہ ضرور ہیں۔ یعنی درجہ ان کا غیر مساوی ضرور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مساوی ہیں لیکن اپنے اپنے طور پر تینوں Sedatives ہیں لیکن یہ سوال آؤٹ آف کورس پوچھا آپ نے ہم سے۔

سوال: آؤٹ آف کورس تو پوچھا لیکن اس کا جواب آپ نے ایسا بلیغ دیا کہ باید وشاید بلکہ مزاح کے بارے میں آپ نے اتنی سنجیدگی کا اظہار کیا کہ اس سے مزاح کے بارے میں ایک مشن کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔

یوسفی: ایسا ہے کہ زندگی کو گوارا بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا آدمی ڈھونڈتا ہے اگر Valium آج سے دو ہزار سال پہلے دریافت ہوگئی ہوتی تو بہت سے فلسفے وجود میں ہی نہ آتے۔ انسان کا مسئلہ دوسرے طریقے سے حل ہو جاتا لیکن اب ایسا ہے کہ زندگی کو قابل قبول اور گوارا بنانا اور خلق خدا کو بھی گوارا اور قابل قبول اپنے لیے بنانا، اس کے اپنے تمام تضادات کے باوجود یہ فریضہ.... فریضہ اس معنی میں کہ خوش رہنا ہر انسان کا حق ہی نہیں فرض بھی ہے..... اور جو شئے بھی اس فریضے کی ادائیگی میں ممد و معاون ثابت ہو وہ نہایت مفید ہے تو اس لحاظ سے مزاح زندگی کو زیادہ گوارا زیادہ خوشگوار بنا دیتا ہے اور ممکن ہے کہ راہ میں پھول نہ کھلاتا ہو لیکن کانٹے بہت سے ہٹا دیتا ہے راستے سے۔ اب مذہب اس کو رضائے الٰہی میں راضی رہنا کہتا ہے دانتے اپنے طور پر کہتا ہے کہ

"In his will alone we shall find peace"

مزاح دوسرے طریقے سے ایک سمجھوتہ کرتا ہے۔ زندگی کے ساتھ، کہ جو چیز ہمیں بظاہر..... میں اس کے لیے انگریزی کے الفاظ استعمال کروں گا Incongrouous..... لگتی ہے Ananolous لگتی ہے یا Hostile لگتی ہے یا Abnormal لگتی ہے Absurd لگتی ہے ..... یہ تمام چیزیں ہیں جن کو مزاح قابل قبول بنا دیتے اس لیے کہ یہی اس کے موضوعات ہیں۔ اس لحاظ سے مزاح زندگی کو سہنے کے لائق اور Enjoy کرنے کے لائق بناتا ہے اور بھی چیزیں بناتی ہیں ان میں یہ بھی ایک ہے۔

سوال: مشکل پسندی کے ساتھ ساتھ نقاد حضرات آپ کے اسلوب میں دقّت پسندی کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس میں صنّاعی بہت ہے۔ اس میں آورد کا احساس ہوتا ہے اور یہ کہ اس میں Spontaneity نہیں ہے۔ تو کیا آپ اس اعتراض سے متفق ہیں؟

یوسفی: دیکھئے دوسروں کا کیا تاثر ہے تو اس کے بارے میں تو میں صرف یہی کہوں گا ممکن ہے وہ تاثر درست ہو لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں جس چیز کو Spontaneity کہا جاتا ہے وہ ہم نے شعر سے اخذ کیا ہے ہمارے ہاں اس بات پر بڑا فخر کیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور جو لکھ دیتے ہیں وہ کاٹتے

نہیں۔ یہ بات بڑی فخریہ بیان کی جاتی ہے اور بڑی تعریف کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہی بات آپ انگریزی میں لکھ دیں تو اس سے بڑا Condemnation اس شخص کا نہیں ہوسکتا کہ انتہائی کاہل آدمی ہوں جیسے ہیمنگ وے ہے۔ ہیمنگ وے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاں آمد ہی آمد ہے۔ اس سے زیادہ سلیس، سادہ انگریزی اور مفرد الفاظ کسی نے استعمال نہیں کیے بلکہ جو مکالمہ اس نے لکھا اس کی مثال اس سے پہلے کوئی نہیں ملتی بے ساختگی اور اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ صاحب اس نے تو زبان کو جو اس کا Best Medium ہوتا ہے اس پر لے آیا۔ درست اپنی جگہ اس کو نوبل پرائز جس کتاب کے بعد ملا یعنی Old man and the sea یہ کتاب جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی سوا سو صفحے کی کتاب ہے۔ اس وقت تک اس کے نوے مسودے مل چکے ہیں۔ وہ تو خیر ٹائپ میں تھے لیکن اس وقت تک نوے تصحیح شدہ ڈرافٹ اس کے مل چکے ہیں یہ اس شخص کا ذکر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ Spontaneous کوئی اور نہیں تھا۔ ہر فن ایک ریاض چاہتا ہے۔ اگر اس میں آورد معلوم ہوتی ہے۔ تو وہ میری محنت کا قصور نہیں ہے۔ میرے فن کی خامی ہے تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے زیادہ محنت کی اس لیے خراب ہو گیا۔ بلکہ یہ ہے کہ میرے فن میں خامی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے لیکن یہ خیال کر لینا کہ بعض لکھنے والے ایسے ہیں جو قلم زد نہیں کرتے۔ یہ بذاتہ کوئی خوبی کی بات قطعی نہیں اور اس کا فن کی اچھائی یا برائی سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ دیکھئے کہ پروست ایک ہی ناول پر پندرہ سال کام کرتا رہا اور مرنے سے ایک دن پہلے تک بھی اس کی تصحیح کر رہا تھا۔ اب اگر اس میں کوئی خامی ہے کہ وہ فنی خامی الگ چیز ہے لیکن اس پر ہم اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ آپ نے اتنا عرصہ کیوں لگایا اس کے لکھنے میں۔ اب جہاں تک میرے بارہ سال کا تعلق ہے تو اس عرصے میں کچھ پیشہ وارانہ تبدیلیاں زندگی میں آئیں۔ میں یہاں سے لندن چلا گیا۔ پھر وہاں میری بیماریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دل کی بیماری اور السر وغیرہ۔ اب ایک اور آپریشن میرا ہونے والا ہے۔ یہی آپریشن حال ہی میں الزبیتھ ٹیلر کا بھی ہوا تھا۔ آپ مسکرائیے نہیں مماثلت یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ گردے کی اس تکلیف کی وجہ سے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ لکھ نہیں سکتا۔ پچھلے سات آٹھ سال سے یہ تکلیف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ میں بچپن ہی سے فرش پر بیٹھ کر اور یہاں گھٹنے پر رکھ کر جیسے کاتب اور منشی اور پرانے زمانے کے بڈھے لکھا کرتے ہیں، اردو میں اس طریقے سے لکھتا ہوں، انگریزی میز کرسی پر بیٹھ کر لکھتا ہوں، انگریزی میں فرش پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا اور اردو میز کرسی پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا۔ تو میں ان الجھنوں میں گرفتار رہا۔ لیکن اس کے باوجود جیسا میں نے آپ کو بتایا کہ اس وقت ایک ساڑھے چار سو صفحہ کی کتاب تیار ہے۔ اتنی ہی ضخامت کی کتاب ناپختہ حالت میں وہاں پڑی ہوئی ہے تو بارہ سال میں نو سو صفحے کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ مزاح میں آپ بتائیے کہ اتنی مقدار میں کتنے اور لوگوں نے لکھا ہے اب تک بارہ سو صفحہ بنتے ہیں میرے، اس میں اگر اللہ نے اور زندگی دی تو ممکن ہے اور اضافہ ہو جائے۔

سوال: ابھی آپ نے اپنی مزاح نگاری کے ساتھ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کا ذکر کیا۔ آپ کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ جس سے ہم سب واقف ہیں کہ آپ ہمارے سربرآوردہ مزاح نگار ہی نہیں، صاحب اسلوب نثر نگار بھی ہیں، دوسری طرف آپ مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز اور متمکن رہے ہیں جن کا ادب سے کوئی واسطہ نہیں تو ایک ادیب اور ایک اہم افسر کی آپ کی جو دو حیثیتیں ہیں آپ ان میں کس طرح تفریق کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خاصا ذاتی سوال ہے؟

یوسفی: صحیح ہے مگر اس سے مجھے کوئی الجھن نہیں ہوتی بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ تازگی ہماری اردو میں خاص طور سے جو آئی ہے وہ ہمیشہ Outsiders لاتے ہیں تو وہ لوگ جن کا پیشہ یا اوڑھنا بچھوٹا ادب یا صحافت ہے ان کے ہاں وہ تازگی جس کی آپ توقع رکھتے ہیں بعض اوقات نہیں ملتی۔ لکھنا پڑھنا ہمارے لیے منکوحہ کی نہیں محبوبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کبھی اس میں کوئی الجھن ہمیں محسوس نہیں ہوئی بلکہ ہمیں اچھا لگتا ہے کہ دن بھر کی مصروفیات کے بعد ایک بالکل دوسری دنیا میں آدمی داخل ہو۔ اچھا آپ نے اسلوب کے Perfectionism کے بارے میں جو سوال کیا تھا اس پر ایک دلچسپ قصہ سناؤں آپ کو۔ وہ قصہ یہ ہے کہ جناب کہ ہم کبھی کسی کی فرمائش پر لکھتے نہیں ہیں۔ بہت پہلے کا ذکر ہے یہ کوئی ۱۹۵۰، ۱۹۵۵ء کے آس پاس کہ جب ہمیں ساڑھے چار سو یا پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی اور ہم نے لکھا شروع کیا تھا ہمارے دوست حنیف رائے ''سویرا'' کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ انہوں نے ہم سے فرمائش کی کہ فلاں موضوع پر آپ لکھ دیجئے۔ ہم نے لکھ دیا۔ اب جب اس کے چھپنے کے دن آئے تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے نہایت لغو چیز لکھی ہے بالکل لغو، اور ہم اس کو Face نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں ہم مشتاق احمد کے نام سے لکھتے تھے۔ اس خیال سے کہ لوگ ہمیں پہچان نہ سکیں اس لیے کہ بنک میں لکھنے پڑھنے والے لوگوں کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ ان پر بھروسہ نہیں کرتے اور ایک صاحب نے بڑی اچھی بات ہم سے کہی۔ کہنے لگے کہ دیکھئے برا نہ مانئے گا۔ کہا فرمائیں کہنے لگے کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ وہ ایک ماہر امراض چشم ہے۔ بہت اچھا اور شاعر بھی ہے تو آپ آپریشن اس سے کروائیں گے یا اس سے کروائیں گے جو صرف آنکھوں کا سرجن ہے۔ تو اسی بنا پر وہ صاحب اس بینک میں پیسہ نہیں رکھتے تھے جس میں، میں ملازم تھا۔ وہ قصہ یہ ہوا کہ ''سویرا'' رسالے میں وہ مضمون چھپا۔ پنجاب بک ڈپو والے ایجنٹ ہیں یہاں اس کے، میں ان سے روز ٹیلی فون پر پوچھتا ہوں کہ رسالہ آیا کہ نہیں آیا۔ ایک دن انہوں نے کہا آ گیا ہے۔ میں نے پوچھا کتنی کاپی ہیں۔ انہوں نے کہا آپ کو کتنی درکار ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں آپ کے پاس کتنی آئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب سو آئی ہیں تو میں گیا اسی وقت میری تنخواہ اس وقت کل کٹ کٹا کر ساڑھے چار سو روپے سے زیادہ نہیں تھی تین روپے کی ''سویرا'' کی ایک کاپی تھی سو کاپی ان کی تین سو روپے میں لے آیا اور لا کر میں نے بینک میں چپراسی تھا اس سے کہا کہ میاں اس کو Shredding Machine میں سب ڈال دو۔ اس کے بعد جیسے میں آپ کو فخریہ قصہ سنا رہا ہوں کہ صاحب میں تو اتنا نفاست پسند ہوں کہ میں نے یہ کیا تو میرا خیال تھا کہ اس کے بعد کراچی میں تو میری بدنامی نہیں ہوگی۔ تو جیسے اس وقت آپ کو فخریہ قصہ سنا رہا ہوں تو میں یہ قصہ اس کے چار پانچ دن بعد ایک صاحب کو سنانے لگا۔ ان کا نام میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ مگر آپ ریکارڈز پر نہ لائیے گا تو میں نے ان سے کہا کہ بھئی نے تو یہ کہا، ہماری غیرت گوارا نہ کر سکی اور ہم نے یہ کر دیا تو وہ صاحب ایک دم بپھر گئے یعنی نہایت مودب اور نہایت با اخلاق آدمی تھے کہنے لگے کہ یہ آپ نے کیا کیا۔ اس سے بڑی تو کوئی بد ذوقی نہیں ہو سکتی۔ یہ کام تو پہلے ایک دفعہ ہوا تھا جب اسکندریہ میں لوگوں نے کتب خانہ جلا دیا تھا۔ وہ الزام ہے مسلمانوں پر مگر آپ نے اس سے بدتر کام کیا۔ میں نے کہا بات کیا ہوئی۔ پتہ یہ چلا کہ ''سویرا'' کے اس شمارے میں ان کی پہلی غزل چھپتی تھی۔ میں نے اس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی غزل بھی غارت ہو گئی۔ میرا مقصد ان کی غزل پر پانی پھیرنا نہیں تھا بلکہ اپنی تحریر کے بارے میں ایک معیار کی پابندی تھی میں نے اس معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

طارق حبیب

مضمون

مشتاق احمد یوسفی کی شخصی اور ادبی زندگی

یہ اردو زبان و ادب کی خوش قسمتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی جیسا ادیب اور دانشور اسے میسر آیا۔ تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ ناقدین فن کا اس امر پر اتفاق بھی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اردو زبان وادب کے بے مثال ادیب ہیں۔ کسی ادیب کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا عہد اسے محبت اور اخلاص سے اپنائے اور اپنا سرمایہ تسلیم کرے۔

مشتاق احمد یوسفی کا آبائی وطن جے پور، ضلع ٹونک، راجستھان، بھارت ہے وہ وہاں کے مقامی (Native) مسلمان تھے۔ ان کے باپ دادا جے پور میں نسلوں اور پشتوں سے آباد تھے۔

مشتاق احمد یوسفی اندرون سانگا نیری گیٹ، جے پور میں رہتے تھے۔ یہ ان کا آبائی مسکن ہے۔ ان کی پیدائش ٹونک میں ہوئی، پھر آٹھ سال کی عمر میں واپس جے پور آ گئے، مادری زبان ماروا ڑی ہے۔ ددھیال سے یوسف زئی پٹھان اور ننھیال سے راجپوت (راٹھور) ہیں۔ غور کیجئے کہ اردو، ان کی مادری زبان نہیں ہے، لیکن کمال لگن، شبانہ روز محنت اور عطائے رب کریم سے زبان اردو میں جو مقام انہیں حاصل ہوا، وہ اہل زبان کو بھی بعض اوقات کم ہی نصیب ہوتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی ہے۔ وہ سینٹ مسلم لیگ کے صدر حزبِ اختلاف اسمبلی کے لیڈر اور قانون ساز اسمبلی (Legislative Assembly) کے ڈپٹی سکریٹری رہے۔ جے پور میونسپلٹی کے دو مرتبہ میئر (Mayor) بھی رہے۔ پھر سیاسی وجوہات کی بنا پر انہیں جے پور (بھارت) چھوڑنا پڑا۔ سقوط حیدرآباد کے موقع پر اپنی حق گوئی کے باعث پاکستان اور مسلمانوں کے موقف کی بھرپور حمایت کے صلے میں انہیں ہجرت کرنا پڑی۔

بقول یوسفی: ''وہ بہت صاف گو انسان تھے، سچ کہنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے تھے۔ تو Legislative Assembly کے ایک اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ وہ دن تھا جب حیدرآباد پر حملہ ہوا تھا اور قائداعظم کی وفات کا بھی یعنی 11/ستمبر ۱۹۴۸ء کا دن تھا، تو وہاں کسی کانگریسی ممبر نے یہ Resolution پیش کیا کہ حیدرآباد فتح ہو گیا ہے، اس کی خوشی میں چھٹی ہو جانی چاہیے، تو میرے والد جو Session کی صدارت کر رہے تھے، انھوں نے یہ Ruling دی کہ چھٹی کا کوئی جواز نہیں بنتا، اس لیے کہ آج اگر آپ اس خوشی میں چھٹی کرتے ہیں کہ حیدرآباد فتح ہو گیا ہے، تو کل جب پاکستان، کشمیر فتح کر لے گا، تو آپ کتنے دن سوگ میں بند رہیں گے۔ تو یہ سننا تھا کہ ادھم مچ گیا۔ لوگوں نے انہیں پھر یہ مشورہ دیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے چلے جائیں۔''

یوں عبدالکریم خان یوسفی اس واقعے کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں جے پور سے ہجرت کر کے حیدرآباد (پاکستان) آ گئے۔ یہاں انہوں نے کوئی ملازمت یا کاروبار نہیں کیا۔ ۲۶/ جون ۱۹۵۰ء کو بہ حالتِ روزہ، جب وہ حیدرآباد سے ٹنڈو آدم گئے ہوئے تھے ان پر دل کا دورہ پڑا اور خالق حقیقی سے جا ملے اور حیدرآباد کے پھلیلی قبرستان میں ۲۷/ جون ۱۹۵۰ء کو سپرد خاک ہوئے۔

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے آغاز میں عبد الکریم خان یوسفی اور مسعود جہاں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کیں۔ چاروں کے نام شوکت آرا، مشتاق احمد خاں یوسفی، فردوس جہاں اور ادریس احمد خان یوسفی ہیں۔

سرکاری کاغذات کے مطابق مشتاق احمد یوسفی ۴؍ اگست ۱۹۲۳ء کو ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے۔ یہی تاریخ ان کے میٹرک کی سند میں بھی درج ہے۔ یہی تاریخ زکریا یونیورسٹی ملتان میں لکھے جانے والے ایم اے (اردو) کے مقالے میں بھی درج ہے۔ انہوں نے انٹرویو کے دوران میں خود بتایا کہ:

''Official تاریخ پیدائش ۴؍ اگست ۱۹۲۳ء ہے۔ اصل تاریخ پیدائش اور ہے، جس کو میں اس لیے نہیں بتایا کہ اس سے میری ملازمت، میری پنشن وغیرہ سب Effect ہوتی ہیں۔ تھوڑا بہت فرق جیسا پہلے زمانے میں ہوتا تھا، وہ ہے۔ یہ تھوڑا سا فرق ہے، جو میں نہیں بتاؤں گا''۔

زندگی کے پہلے آٹھ سال مشتاق احمد یوسفی نے ٹونک ہی میں بسر کیے، وہیں سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور تیسری جماعت تک ٹونک ہی میں زیر تعلیم رہے۔ پھر ۱۹۳۱ء میں اپنے آبائی شہر جے پور واپس آ گئے۔ مہاراجہ ہائی اسکول جے پور سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ حساب، فارسی اور ڈرائنگ میں کمزوری یا عدم دلچسپی کی بنیاد پر انہیں میٹرک میں سیکنڈ کلاس میسر آئی لیکن میٹرک کے بعد مہاراجہ کالج جے پور (راجپوتانہ بورڈ) سے انٹرمیڈیٹ میں فسٹ کلاس فسٹ رہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ راجپوتانہ بورڈ سے انٹرمیڈیٹ میں اول پوزیشن پر گولڈ میڈل حاصل کرنے والے وہ پہلے مسلمان ہیں۔

انٹرمیڈیٹ میں انہوں نے انگریزی ادب، تاریخ، فلسفہ اور اردو جب کہ بی اے میں انگریزی ادب، فلسفہ اور تاریخ کے مضامین پڑھے اور مہاراجہ کالج جے پور (آگرہ یونیورسٹی) سے ۱۹۲۳ء میں بی اے میں اول پوزیشن اور انگریزی ادب میں ریکارڈ قایم کرنے پر کرنل اوگلوی گولڈ میڈل، حاصل کیا۔ یہ میڈل اور پوزیشن حاصل کرنے والے بھی وہ پہلے مسلمان گریجویٹ ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ایک بڑی دلچسپ اور قابل رشک بات منظر عام پر آتی ہے کہ ملنگ خان، عبدالکریم خان یوسفی اور مشتاق احمد یوسفی (یعنی دادا، بیٹا اور پوتا) نے ایک اسکول (مہاراجہ ہائی اسکول جے پور) سے میٹرک اور ایک ہی کالج اور تعلیمی بورڈ (مہاراجہ کالج جے پور اور راجپوتانہ بورڈ) سے انٹرمیڈیٹ کیا، نیز مشتاق احمد یوسفی اور ان کے والد نے ایک ہی کالج (مہاراجہ کالج جے پور، آگرہ یونیورسٹی) سے بی اے کیا۔

۱۹۴۵ء میں مشتاق احمد یوسفی نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور فسٹ کلاس فسٹ رہے۔ لیکن اول پوزیشن کے باوجود گولڈ میڈل نہ ملا۔ اسی عرصے میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فسٹ کلاس میں ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی، البتہ کوئی پوزیشن حاصل نہ ہوئی۔

ایم اے فلسفہ اور ایل ایل بی تک تعلیم مکمل کرنے کے اگلے ہی برس یعنی ۱۹۴۶ء میں مشتاق احمد یوسفی نے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس شپ آل انڈیا، کا امتحان پاس کیا، لیکن انہیں یہ ملازمت اس لیے میسر نہ آئی کہ ان کی نظر (Eye Sight) بہت زیادہ کمزور (منفی سات) تھی۔ اس حوالے سے انہوں نے پورے نظام (System) پر بالعموم اور مذکورہ بالا سلیکشن کمیٹی پر بالخصوص بڑی لطیف طنز اور نکتہ چینی کی ہے کہ:

''میری کوئی سفارش نہیں تھی، حالا ں کہ بہتوں کی آنکھیں کمزور ہوتی ہیں''

''والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور عرب جا کر بدوؤں کا مفت علاج کروں''۔

۱۹۴۶ء میں مشتاق احمد یوسفی ''پروونشل سول سروس (PCS) میں آئے اور دسمبر ۱۹۴۹ء تک ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر ہے۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ان کے والد، والدہ، بھائی اور بہن ہجرت کر کے حیدرآباد (پاکستان) چلے آئے۔ یکم؍ جنوری ۱۹۵۰ء کو مشتاق احمد یوسفی خود بھی یہ عہدے، یہ منصب اور یہ

اعزازات چھوڑ چھاڑ کر (کراچی) پاکستان آ گئے۔ان کی بیوی اور ایک بچہ مارچ ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچے۔ اپنی ہجرت کے متعلق بتاتے ہیں۔

''پاکستان میں اس بنا پر آیا کہ جون ۱۹۴۹ء میں انہوں نے یہ طے کیا کہ اردو اب سرکاری زبان نہیں رہے گی۔اس وقت تک اردو سرکاری زبان تھی اور تمام کام اردو ہی میں ہوتا تھا۔اس کے بعد پھر ہم نے رخصت لی اور یہاں آ گئے۔''

مشتاق احمد یوسفی نے جنوری ۱۹۵۰ء میں پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور کراچی شہر کو اپنا مستقر قرار دیتے ہوئے بین کاری کے شعبے سے اپنے درخشندہ تابندہ مستقبل کا آغاز کیا۔

''معماران پاکستان'' اور قائداعظم کے اہم احباب میں ایک نام ایم اے اصفہانی کا بھی ہے، جو ایک غیر سرکاری ہوائی کمپنی Orient Air Ways کے مالک اور مسلم کمرشیل بینک لمیٹڈ، کے چیئرمین تھے، کسی خاص توسط سے مشتاق احمد یوسفی کا ان سے رابطہ ہوا اور اصفہانی صاحب نے ان کا تقرر ''اوری اینٹ ائیرویز'' میں کر دیا۔اسی دوران میں اس کمپنی کا ایک جہاز گر کر تباہ ہو گیا، جس کے باعث یوسفی صاحب نے یہ ملازمت اختیار نہ کی، مگر پھر مسٹر ایم اے اصفہانی ہی کے ذریعے سے وہ بینک کی ملازمت میں آ گئے اور ۴۰ برس تک بینکاری کے شعبے سے وابستہ رہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے ۲ یا ۳ جنوری ۱۹۵۰ء ''دی مسلم کمرشیل بینک لمیٹڈ کے جنرل منیجر مسٹر اینڈرسن کو انٹرویو دے کر ۳/ فروری ۱۹۵۰ء کو Convenented Officer کی حیثیت سے بینک کی ملازمت اختیار کی۔۴/نومبر ۱۹۵۲ء کو Inspector of Branches مقرر ہوئے۔۳/ مارچ ۱۹۵۴ء کو چیف اکاونٹینٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔۲۳/اپریل ۱۹۶۲ء کو مسلم کمرشیل بینک لمیٹڈ کے اسسٹنٹ جنرل منیجر اور یکم اپریل ۱۹۶۴ء سے اپریل ۱۹۶۵ء تک ڈپٹی جنرل منیجر کے عہدے پر تعینات رہے۔۱۹۶۵ء سے ۳۱/دسمبر ۱۹۷۴ء تک آسٹریلشیا بنک لمیٹڈ (جو الائیڈ بنک لمیٹڈ کا پرانا نام ہے) کے مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے جب یکم/جنوری ۱۹۷۴ء کو تمام بینک Nationalized ہوئے یعنی قومیا لیے گئے تو مشتاق احمد یوسفی یکم/جنوری ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک ''یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ'' کے صدر رہے۔۷۸۔۱۹۷۷ء تک پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین رہے۔جنوری ۱۹۷۹ء تک ڈائریکٹر انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان، ڈائریکٹر نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ، وائس چیئرمین آف کونسل آف دی انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز ان پاکستان، ڈائریکٹر پاکستان ایگریکلچرل سٹوریج کارپوریشن، وائس چیئرمین آف دی پاکستان، بینکس ایسوسی ایشن، چیرمین امتحان کمیٹی آف دی انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز ان پاکستان اور چیئرمین ایڈیٹوریل آف بینکران پاکستان کے اعزازی عہدوں پر بھی رہے اور Fellow of the Institute of Bankers in Pakistan تو ایک مستقل چیز ہے۔

جنوری ۱۹۷۹ء میں مشتاق احمد یوسفی لندن چلے گئے جہاں وہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک Bank of Credit and Commerce International کے ایڈوائزر رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ۵/دسمبر ۱۹۹۰ء کو پاکستان واپس آ گئے یوں یہ گیارہ برس کا زمانہ انہوں نے اپنے ملک سے باہر گزارا۔

۱۹۹۰ء کے بعد سے پیشہ وارانہ مصروفیات تمام ہوئیں۔ ۱۹۹۱ء سے کراچی میں فراغت کی زندگی گزار رہے ہیں۔تعلیم سے فراغت اور ملازمت کے حصول کے فوراً بعد ۱۵/ جون ۱۹۴۶ء کو مشتاق احمد یوسفی نے فلسفہ میں ایم اے تک پڑھی لکھی اور اہل زبان خاتون ادریس فاطمہ سے اپنی پسند کی شادی کی۔

اللہ تعالیٰ نے مشتاق احمد یوسفی کو چار بچیوں سے نوازا ہے، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام راشد یوسفی اور چھوٹے کا سروش یوسفی ہے بڑی بیٹی کا نام رخسانہ اور چھوٹی کا سیما

ہے۔ساری اولاد شادی شدہ ہے دونوں بیٹے ارشد یوسفی اور سروش یوسفی انجینئر جب کہ دونوں بیٹیاں رخسانہ اور سیما ڈاکٹر ہیں۔ارشد یوسفی الیکٹریکل انجینئر ہیں اور اپنے بچوں کے ساتھ امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ جب کہ سروش یوسفی میکانیکل انجینئر ہیں اور والد کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔مشتاق احمد یوسفی کی بڑی بیٹی لیڈی ڈاکٹر رخسانہ مانچسٹر کے قریب ایک سرکاری اسپتال میں ایم آر سی پی(MRCP)اور ان کے شوہر ہیں، جنرل فزیشن ہیں۔ یہ لوگ وہیں مستقل اقامت پذیر ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر سیما ماہر امراض جلد(Skin Specialist) ہیں اور کراچی ہی کے ایک اسپتال میں Consultant ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد، سب کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔اردو زبان اور ادب کے اس بے مثال ادیب اور دانش ور کے افکار اور اسلوب عالیہ کی تفہیم تو ان کے لیے بڑی بعد کی بات ہے وہ تو ان ادیب ساز تصانیف کی محض خواندگی(Just Reading) کے بھی قابل نہیں ہیں۔

بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد مشتاق احمد یوسفی نے کراچی کو اپنا مستقر منتخب کیا اور ۱۹۵۰ء سے تا حال کراچی میں مقیم ہیں۔ اس عرصے میں اپنی ملازمت کے باعث انہوں نے نو برس (۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۳ء تک لاہور میں اور گیارہ برس ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک لندن میں گزارے۔ تاہم ان کی باقاعدہ سکونت اور مستقل محبت کراچی ہی سے متعلق رہی۔ جن ممالک کو ان کی زیارت کا شرف میسر آیا ان میں عرب امارات، قطر، بحرین، عراق، لبنان (بیروت)، ایران، عمان، سعودی عرب، اٹلی، فرانس، جرمنی، امریکہ، پانامہ، آئرلینڈ، ساؤتھ افریقہ، زمبابوے اور لندن شامل ہیں۔انہی اسفار میں حجاز مقدس کا سفر بھی شامل ہے۔۱۹۸۲ء میں انہیں حج کے فرض کی ادائیگی کا موقع ملا اور تین چار بار عمرہ کرنے کی سعادت سے بھی نوازے گئے۔۱۹۹۵ء تک انہیں جاپان اور چین جانے کا موقع نہ ملا تھا، جس کی انہیں اب کوئی حسرت بھی نہ تھی۔

مشتاق احمد یوسفی لکھتے ہیں:

''ریٹائرمنٹ کے بعد لندن میں آٹھ نو مہینے رہا۔اس لیے کہ مجھے اپنا فلیٹ بیچنا تھا اور دل کا Operation کروانا تھا تو ستمبر ۱۹۹۰ء میں دل کا By Pass ہوا اور ۵/دسمبر ۱۹۹۰ء کو پاکستان واپس آ گیا اور اس کے بعد پھر میں نے پیشہ وارانہ کام نہیں کیا اس لیے کہ مجھے یہ کہا گیا تھا کہ اب یا تو آپ Professionally Active رہیں اور اگر لکھنے پڑھنے کا آپ کا شوق ہے تو وہ کریں لیکن دونوں کام آپ بیک وقت نہیں کر سکتے۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ جو کچھ کھانا کمانا تھا وہ ہو چکا ہے اب جو تھوڑا بہت وقت بچا ہے وہ میں لکھنے پڑھنے میں گزار دوں، تو اس کے بعد کسی کام کی طرف رخ نہیں کیا''۔

میاں فضل حسن، مسرت علی صدیقی، شیخ منظور الٰہی، مختار مسعود، ڈاکٹر آفتاب احمد، مسعود مفتی، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، افتخار عارف، نور الحسن جعفری، ابن انشاء، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری یوں تو مشتاق احمد یوسفی کے دوستوں میں شامل ہیں۔لیکن ان میں کچھ گہرے دوست ہیں، کچھ سے تعلق خاطر اور کچھ سے چند ایک ملاقاتیں ہیں۔تاہم میاں فضل حسن جو چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ان کی محبت اور ذہانت سے حقیقی معنوں میں مشتاق احمد یوسفی بہت متاثر ہوئے۔ان کی اکثر گفتگو اور انٹرویو میں میاں حسن کا ذکر آتا ہے۔''آب گم'' کے دیباچے میں بھی ان کا بڑا توانا ذکر موجود ہے۔

''رنگوں میں زرد رنگ، خوشبوؤں میں عطر شامہ استعمال کرتے ہیں فوٹو گرافی اور جانور پالنے کا مشغلہ دیر تک اپنائے رکھا۔ پالتو جانوروں میں کتوں سے بہت پیار کرتے ہیں، البتہ بلی سے انہیں کوئی رغبت محسوس نہیں ہوئی۔۱۹۶۳ء میں ایک بندر بھی پالا، جس کا نام بربنائے انتقام، ڈارون رکھا''۔

خرگوش، مرغیاں اور طوطا بھی پالتے رہے۔ لاہوران کا پسندیدہ شہر ہے، تاہم کراچی سے انہیں اس لیے بے حد محبت ہے کہ یہاں ان کا رزق اترا اور ''جہاں سے رزق ملے'' اس جگہ سے، وہاں کے لوگوں سے محبت کرنی چاہیے، ورنہ بندہ Nostalgia میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

گھر میں شلوار قمیص میں رہتے اور اس لباس کو پسند کرتے ہیں۔ باہر البتہ پینٹ کوٹ پہنتے ہیں۔ شراب نہیں پیتے، البتہ کالج کے زمانہ طالب علمی سے ۱۹۷۹ء تک سگریٹ نوشی کرتے رہے ہیں، لندن جانے کے بعد یہ کفر بھی ٹوٹ گیا۔ کتابوں سے عشق کرتے ہیں۔ جلدی غصے میں آجانا ان کی شخصیت کی خامی ہے۔ ایک خامی اور بھی ہے خط کا جواب نہیں دیتے۔ اپنی ذات کی حد تک تو ہم بھی اس امر کی گواہی دے سکتے ہیں۔

نہایت خوش ذوق آدمی ہیں۔ ان کی خوش ذوقی کا اندازہ ان کے ڈرائنگ روم سے بھی ہوتا ہے، (جہاں بیٹھ کر ہم نے ان سے انٹرویو کیا) خوب صورت اور نفیس پینٹنگس دیواروں کے ساتھ آویزاں ہیں۔ کچھ مورتیاں بھی کونوں میں رکھی ہیں اور ہر مورتی کے سامنے سپاٹ لائٹ رکھی ہے جو ان مورتیوں کی نیم روشن کر کے عجیب رومانوی فضا پیدا کرتی ہیں۔

انتہائی با اصول اور کمال پسند (Perfectionist) مشتاق احمد یوسفی، پاکیزہ سوچ انتہائی نفیس خیالات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ شفیق ملنسار، محبت کرنے والے، ہمدرد، محنتی، خوددار، پابند شرع، پرہیز گار، راسخ العقیدہ، حق گو، منکسر و معتدل مزاج اور وضع دار و وفا شعار انسان ہیں۔ انہیں غصہ بہت آتا ہے۔ ان کی تحریروں سے انسان دوستی اور ہمدردی کے آثار شدت سے ہویدا ہوتے ہیں، یاد رکھئے کہ بڑھے ہوئے ہمدردی کے احساس کے باعث انسان کو غصہ بہت آتا ہے، یوں شدید حساسیت اور زود رنجی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تاہم حلیم الطبع اور بردبار ہونے کا وصف انہیں اس مشکل سے بھی سلامتی اور سہولت سے نکال لے جاتا ہے۔

مجموعی طور پر مشتاق احمد یوسفی نے رسائل و جرائد اور اخبارات کے لیے بہت کم لکھا ہے۔ وہ کسی اخبار کے فکاہیہ کالم سے بھی وابستہ نہیں رہے کہ جہاں محض کاغذ کا پیٹ بھرنے کے لیے بہر حال کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے، البتہ مختلف تقریبات کے لیے انہوں نے فرمائشی مضامین ضرور لکھے اور عوام کے ذوق اور رجحانات کو ملحوظ خاطر بھی رکھا، لیکن اپنے معیار کا دامن پھر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

۵/فروری ۱۹۶۱ء کو مشتاق احمد یوسفی نے ''پہلا پتھر'' کے نام سے اپنے مضامین پر مشتمل پہلی کتاب کا مقدمہ لکھا اور ۱۹۶۱ء میں 38 سال کی عمر میں ان کی پہلی کتاب ''چراغ تلے'' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب پہلے پہل ''مکتبہ جدید لاہور'' سے شائع ہوئی اور پھر اس کتاب کو مکتبہ دانیال کراچی کے پلیٹ فارم سے شائع کیا گیا۔

''چراغ تلے'' میں شامل مضامین کو انہوں نے ''کھٹ مٹھے مضامین'' کہا ہے اور ان پر کسی خاص صنفِ ادب کی مہر ثبت نہیں کی (بعد میں ان مضامین کو 'انشائیے' کہا گیا جو کہ درست نہیں) چراغ تلے کا انتساب ''والد مرحوم' کے نام ہے چراغ تلے میں بارہ مضامین شامل ہیں جو پڑیے گر بیمار، کافی، یادش بخیر یا، موذی سنہ جنون لطیفہ، چارپائی اور کلچر اور آنا گھر میں مرغیوں کا کرکٹ صنف لاغر، موسموں کا شہر اور کاغذی ہے پیرہن کے عنوانات اور ترتیب سے موجود ہیں۔

'چراغ تلے' کی اشاعت کے ۹ سال بعد ان کی دوسری کتاب ''خاکم بدہن'' جنوری ۱۹۷۰ء میں ''مکتبہ اردو انجسٹ سمن آباد لاہور'' سے شائع ہوئی۔ ''خاکم بدہن'' میں آٹھ مضامین شامل ہیں، جنہیں انہوں نے ''خاکے اور مزاحیے'' کا نام دیا۔ خاکم بدہن میں صیغے انڈسٹریز، سینما تاہری اور مرزا، بارے آلو کا کچھ بیان ہو جائے، پروفیسر ہوئے مر کے ہم جو رسوا، بل اسٹیشن، بائی فوکل کلب

اور چند تصویر بتاں شامل ہیں مکتبہ دانیال کراچی کے تحت یہ کتاب اب تک چودہ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے اپنی زوجہ محترمہ ادریس فاطمہ کے نام منسوب کیا۔ ''خاکم بدہن'' کو ۱۹۷۱ء میں آدم جی ادبی ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ جو بقول شخصے آدم جی ادبی ایوارڈ کی حوصلہ افزائی تھی۔

''خاکم بدہن کی اشاعت کے ۶ سال بعد ۲۷/جنوری ۱۹۷۶ء کو ''تزک یوسفی'' کے نام سے مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تیسری کتاب زرگزشت کا مقدمہ قلم بند کیا۔ یہ یکم اپریل ۱۹۷۶ء کو مکتبہ دانیال کراچی سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی اور اب تک اس کی نو اشاعتیں عمل میں آچکی ہیں۔ زرگزشت مشتاق احمد یوسفی کی Banking Life کے روز وشب کی داستان ہے، جو پچیس برسوں پر محیط ہے۔

۱۹۷۹ء میں مشتاق احمد یوسفی لندن، برطانیہ چلے گئے۔ زرگزشت کے ۱۴ برس بعد ''غنودیم غنودیم'' کے زیر عنوان ۱۶/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو اپنی چوتھی کتاب ''آب گم'' کا مقدمہ تحریر کیا اس کی پہلی اشاعت فروری ۱۹۹۰ء میں مکتبہ دانیال کراچی سے ہوئی۔

''آب گم کا انتساب'' اپنے بچوں ارشد، سروش، رخسار اور سیما کے نام'' ہے۔ مکتبہ دانیال کراچی، ہی سے یہ کتاب چار بار شائع ہو چکی ہے۔ آب گم کے پانچ ابواب حویلی، اسکول ماسٹر کا خواب، کار کابلی والا اور الہ دین بے چراغ، شہر دو قصہ اور دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ شامل کتاب ہیں۔ اس کتاب پر انہیں ''ہجر ایوارڈ'' (ہجرہ ایوارڈ) دیا گیا۔

''آب گم'' کے مقدمے سے پتہ چلتا ہے کہ زر گزشت، کا دوسرا حصہ بھی لکھا گیا تھا جسے شائع بھی ہونا تھا، نیز آبِ گم، کے علاوہ پانچ مزید اسی نوعیت کے طویل مضامین تھے جو لندن ہی میں رقم ہوئے تھے لیکن مشتاق احمد یوسفی کے مطابق یہ دونوں کتابیں اب خواب ہوئیں اب ایک اور پانچویں کتاب جو مکمل پڑی ہے مدتوں سے اپنی اشاعت کا راستہ دیکھتی ہے جس کے متعلق انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ نئی کتاب میں تمام ابواب ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتے ہیں۔

دراصل مشتاق احمد یوسفی نے سستی شہرت کمانے کا بہر حال کوئی جتن نہیں کیا، انہوں نے اپنے فن پر بھرپور توجہ دی، صبر اور ریاضت سے کام لیا، حوصلے اور ضبط کے ساتھ لکھا پھر جو کچھ خود سے شائع کیا اپنی کتابوں ہی میں شائع کیا وہ تراش تراش کر اور پھونک پھونک کر قلم رکھنے والے فنکار ہیں۔ یوں مشتاق احمد یوسفی کی بڑھی ہوئی احتیاط پسندی نے انہیں اعلیٰ درجے کا ادیب ضرور بنا دیا۔ حالاں کہ راجستھان کے ایک پٹھان سے، جس کی مادری زبان مارواڑی ہو، ایسی ادبی زبان تحریر کرنے کی توقع بھلا کب کی جاسکتی ہے؟ لیکن ایسا ہوا اور پھر ایک دن آیا، جب یہ پٹھان اقلیم زبان و ادب اردو کا شہنشاہ نامزد ہوا اور اردو ہی پر کیا موقوف، مشتاق احمد یوسفی انگریزی زبان میں لکھنے کی شاید اس سے بھی زیادہ استعداد اور توفیق رکھتے ہیں، لیکن صد شکر کہ انہوں نے اپنے اظہار کے لیے اردو زبان و ادب کو اپنا وسیلہ بنا کر اس کا دامن چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آب گم جیسے کوہ نور ہیروں سے مالا مال کر دیا۔

۱۹۷۱ء میں ''خاکم بدہن'' کی اشاعت کے بعد مشتاق احمد یوسفی کو آدم جی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ زرگزشت کی اشاعت بھی آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازی گئی۔ اب آب گم کی اشاعت پر انہیں ہجر ایوارڈ، دیا گیا۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر مشتاق احمد یوسفی کو ان کی ادبی خدمات پر ''ستارۂ امتیاز'' سرفراز کیا گیا ۱۹۹۶ء میں انہیں بولان ایوارڈ، ۲۰۰۰ء میں کمال فن ایوارڈ اور ۲۳/مارچ ۲۰۰۲ء کو ان کی خدمات میں مجموعی علمی و ادبی خدمت کے حوالے سے ہلال امتیاز پیش کیا گیا۔ حکومت اور عوام دونوں نے مشتاق احمد یوسفی کے جیتے جی ان کے دست فن شناس پر بیعت کی ہے۔ کسی سچے ادیب کی عظمت کا یہ بھی ایک ادنیٰ ثبوت خیال کرنا چاہیے۔ (تلخیص)

☆☆☆

سعیدہ بانو احمد

ڈگر سے ہٹ کر

ایک طرف بٹلر کے لکھنو کی معاشرت وہاں کے مرد اور عورتیں تیزی سے پستی کی جانب جا رہے تھے۔ لیکن انہوں نے اس راستے کو ایسا باغ و بہار بنا دیا تھا کہ کسی کو ہوش ہی نہیں تھا کہ اس خوبصورت فضا کے پیچھے کیسی تباہی چھپی ہوئی ہے۔ یہ تھا لکھنو کا ایک رُخ۔

دوسری طرف انگریزوں کی تہذیب ان کا رہن سہن، صفائی ستھرائی، وقت کی پابندی، پڑھنے لکھنے پر زور دینا، نظم وضبط کی زندگی جڑ پکڑ رہی تھی۔ عورتیں ہر زمانے میں کسی حد تک ایک تماش بین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم لوگ بٹلر کا لکھنو بھی دیکھ رہے تھے اور اپنا گھریلو رہن سہن بھی۔ جہاں پرانی رسموں کی جکڑ بند، ان کا ظلم اور جبر، شادی بیاہ کی خوشیاں، مشترکہ خاندان کی چہل پہل ہمیں بہلائے رکھتی تھیں۔ لیکن بالآخر کب تک۔ پردے سے باہر کی زندگی کا حال عورتوں کا کانوں تک پہنچنے لگا۔ لڑکیوں میں یہ امنگ ابھرنے لگی کہ ہم بھی پڑھنا لکھنا چاہتے ہیں خصوصاً انگریزی۔ مردوں میں ہزاروں ایسے لوگ تھے جو بچیوں کو جہالت کے پردے سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن قدامت پسندی کے اثر سے نکلنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کی بیداری کے سہارے مردوں نے بھی قدم بڑھایا۔ لڑکیوں کے اسکول کھلنے لگے، بچیاں پڑھنے لگیں۔ اس طرح تعلیم کے چرچے عام ہونے لگے۔ لڑکوں کے اسکول اور کالج تو تھے ہی اب لڑکیوں کے اسکول اور کالج بھی کھل گئے۔ مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کا رواج کم تھا لیکن تھا۔ میں جب از بیلا تھوبرن کالج پہنچی تو مجھ سے پہلے میری کئی جاننے والی لڑکیاں وہاں سے بی اے پاس کر چکی تھیں۔ تارا گوروالا، سیسلیا فلپس، کنیز بانو، صبور النساء، نور النساء۔ یہ وہ چند نام ہیں جو آئی ٹی کالج کی نمایاں طالبات سمجھی جاتی تھیں۔ آئی ٹی کالج اس وقت عروج پر تھا۔ امریکن اسٹائیل سے بنی اس کی پرشکوہ عمارت دور سے ہی علم وفضل کی آماجگاہ نظر آتی تھی۔ سارے پروفیسر اور استاد امریکن عورتیں تھیں۔ وہاں کے ماحول میں علم، بیداری، اجالا، روشنی گھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لڑکیوں کی چال ڈھال بھی ویسی ہی تھی اپنے میں اعتماد اور بھروسہ لیے ہوئے۔

میرے بعد جو نمایاں شخصیتیں کالج سے پڑھ کر نکلیں وہ ہیں پریما کھنہ، سیسلی سیڑسی، عطیہ حسین، شاردہ راؤ، سکینہ ظہیر ویاس، قرۃ العین حیدر، وحیدہ بانو، شکنتلا جسپال، مایا، رتنا، کم عمر لوگوں میں تعلیم کا شوق کافی جوش وخروش سے پیدا ہو گیا تھا۔ صاحب استطاعت لوگ اپنے بچوں کو ولایت بھیج رہے تھے۔ لکھنو میں جاگیریں دے کر تعلقداری نظام قایم تھا۔ ان تعلق داروں کو راجہ مہاراجہ نواب کے خطاب عطا کر دیئے گئے تھے۔

چنانچہ میرے زمانے کے لکھنو میں رانیوں، مہارانیوں، بیگمات اور لیڈی صاحبان کی کمی نہ تھی! اور یہ سب کی سب پردے میں تھیں۔ انگریز عورتیں ان کے گھروں میں جاتیں۔ ہندوستانی بولنے کی کوشش کرتیں۔ ان عورتوں سے رانیوں، مہارانیوں، بیگمات اور اونچے گھروں کی بیویوں کے تعلقات بڑھنے لگے۔ پردہ پارٹیاں ہونے لگیں۔ جہاں مکمل پردے کا انتظام ہوتا تھا! یہ پارٹیاں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ رانیاں بیگمات اور انگریز عورتیں گھل مل رہی ہیں۔ کوئی انگریزی بول رہا ہے، کوئی اردو اور کوئی ہندی۔ آدھی بات سمجھ میں آ رہی ہے آدھی مسکراہٹ میں ٹالی جا رہی

ہے۔اس طرح ہندوستانی عورتیں دھیرے دھیرے مغربی تہذیب سے متار ہونے لگیں اور یہ احساس بڑھنے لگا کہ کاش ہم لوگ بھی انگریز عورتوں کی طرح آزادی سے باہر نکل سکتے۔ بزرگ اور باہمت عورتوں میں یہ خیال ابھرنے لگا کہ ہم پردے میں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ بیگم حبیب اللہ، رانی منڈی، رانی وم بہادر شاہ، لیڈی وزیر حسن، بیگم وسیم، رانی رہواں اور ایسی بہت سی خواتین نے جمع ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک جماعت قایم کی جائے جس کا نام لکھنو ویمنس ایسوسی ایشن (Lucknow Women's Association) ہو۔ دس پندرہ میٹنگوں کے بعد یہ ایسوسی ایشن بن بھی گئی۔ جن خواتین کے نام میں نے اوپر لکھے ہیں یہ سب پردے میں تھیں لیکن دبنگ عورتیں تھیں۔ انہوں نے دوڑ دھوپ کر کے اور بہت سی عورتوں کو اس ایسوسی ایشن کا ممبر بنایا۔ اب ہر ہفتے ایسوسی ایشن کی میٹنگ ہوتی اور عورتوں کی بہبودی کے کام کرنے کے منصوبے بنائے جاتے۔ ایک گروپ عورتوں کے جیل خانے جا کر مجرم عورتوں کو پڑھانے لکھانے کے لیے مقرر کیا گیا جن عورتوں کو سلائی بنائی آتی تھی وہ ہفتے میں تین بار غریبوں کے لیے کپڑے سیتیں اور بنائی کرتیں۔ دو تین گروپ ایسے بنائے گئے جو محلے کے غریب بچوں کو پڑھا لکھنا سکھائیں۔ یہ سب چھوٹے موٹے کام تھے۔ لیکن گھر میں بند عورتوں کو کچھ تسکین تو ہوئی کہ وہ کچھ کام کر رہی ہیں۔ زمانہ کروٹیں بدل ہی رہا تھا۔ بتدریج پردہ غائب ہوا اور عورتیں مغربی تہذیب میں گھل مل گئیں اور انگریزوں سے بھی آگے نکل گئیں۔

بچپن اور نوجوان کے الھڑ پن اور بھوپال کے بے فکر زمانے کو چھوڑ کر اب میں لکھنؤ میں تھی۔ عمر کے تقاضے کی تمام بے ڈھنگی حرکتیں اب بھی موجود تھیں۔

لیکن اب انھیں کوزے میں بند کرنے کی ضرورت تھی۔

لکھنو کی فضاء میں عجب گھٹن سی تھی۔ اور مجھ سے یہ امید کہ میں ایک مثالی لڑکی بن کر لوگوں کے سامنے آؤں۔ وہ تو شکر یہ تھا کہ میں نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ اور مجھے IT کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ جہاں کچھ آزادی سے سانس لینے کا موقع ملا، میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ پڑھنے میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ ہاں کھیل کے میدان میں سب سے آگے نکل جاتی۔ پھر یوں ہوا کہ میرے والدین کو لکھنو کی گرمی ناقابل برداشت لگی اور نہوں نے یہ طے کیا کہ گرمیاں گزارنے ہم لوگ مسوری چلے جائیں، مسوری کی دنیا دوسری تھی۔ میرے والد کے بنیادی خیالات بہت وسیع تھے۔ چنانچہ انہونے نے لکھنو کے معاشرے کے بندھے ٹکے بندھنوں کو نظر انداز کر کے ہم سب کو مسوری میں آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔ ہمارے والد کی تربیت میں سچائی، ایمانداری، رواداری، بڑوں کا ادب، ہمسایوں کی دل جوئی، غرض کہ انسانیت کے سارے اصول ہمارے ذہن نشیں کر دیئے گئے تھے۔ انہیں مجھ پر بھروسہ بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خیال میں ہماری آزادی کا جو نقشہ بنایا وہ یہ تھا کہ خوب گھومو پھرو خریداری کو جاؤ۔ پکنگ سنیما سب اپنی سہیلیوں کے ساتھ جاؤ۔ بس مردوں کی سنگت نہ ہو۔

اس وقت کی معاشرت میں لڑکے لڑکیاں ساتھ تو ہوتے نہیں تھے۔ میرے مختصر خاندان میں کوئی چچا زاد ماموں زاد بھائی بھی نہیں تھے۔ بس سہیلیاں ہی سہیلیاں تھیں تو ہمیں یہ اتنی پابندی بالکل نہیں کھلی۔ اگر کبھی اتفاق سے ہمارے بھائی کا ساتھ ہو گیا اور راستے میں ان کے کوئی دوست مل گئے تو وہ سڑک کے اس پار جا کر ان سے مل لیتے۔ یہ عجب بے معنی سا طریقہ زندگی تھا مگر تھا۔ اور ہم لوگ اس میں خوش تھے۔ عورتوں کی پارٹیاں اور دعوتیں ہوتیں۔ ہمارے لیے کافی تفریح کا سامان تھا۔ مسوری میں ایک ہوٹل تھا Savay جس میں Cabaret اور انگریزی ناچ وغیرہ ہوا کرتا

تھا۔ وہاں جانے کی ہم سب کو بہت حسرت تھی۔ اور ایک دن یہ حسرت اس طرح پوری ہوئی کہ ہم لڑکیوں اور خواتین کو اوپر Balcony میں بٹھایا گیا جہاں سے ہم Savay کے بڑے ہال میں جو عورتیں و مرد مل کر ناچ رہے تھے، انہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان میں زیادہ تر انگریز مرد اور عورتیں تھیں چار چھ جوڑے۔ ہندوستانی بھی تھے، ایک ہندوستانی لڑکی مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ اس کی عمر کم تھی اور وہ سرخ ساڑی پہنے تھی، اونچی ایڑی کا جوتا تھا اور بڑی خوب صورتی سے انگریزی ناچ ناچ رہی تھی۔ مجھے اس پر رشک آ رہا تھا۔ میرا ناچنے کو بھی جی چاہتا اور سرخ رنگ کے کپڑے مجھے بہت پسند تھے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ کنواری لڑکیاں نہ تو سرخ رنگ پہن سکتی تھیں، نہ پیروں میں مہندی لگانے اور ناک میں کیل پہننے کی اجازت تھی۔ ناک میں کیل اور پیروں میں مہندی کا تو مجھے شوق نہیں تھا مگر لال رنگ کی ساڑی پہننے کے لیے میں مری جا رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سرخ ساڑی والی لڑکی Oxford سے پڑھ کر واپس آئی تھیں اور لاہور کے اونچے گھرانوں کی بیٹی تھیں شادی شدہ نہیں تھیں۔ ان کے گھر کا رہن سہن بہت انگریزیت کا تھا۔ مجھے ان باتوں نے تو مرعوب نہیں کیا لیکن لال ساڑی کا ارمان بری طرح ذہن پر چھا گیا۔ اماں سے منتیں کیں کہ ایک لال ساڑی بنوا دیجئے کچھ دنوں وہ مجھے ٹالتی رہیں۔ پھر راضی ہو گئیں اس شرط پر کہ اپنے جیب خرچ سے ساڑی خرید لو۔ مجھے دس روپیہ جیب خرچ ملتا تھا اور دو چار روپے ادھر ادھر سے حاصل کر لیتی۔ بھائی کے روپے پڑے دیکھے انہیں اٹھا لیا۔ پھر واپس نہیں کیے۔ اماں سے ایک دو روپے اور مانگ لیے۔ اس طرح پندرہ روپے مہینہ تو بن ہی جاتا تھا۔ اس زمانے میں بہترین French Crepede پانچ روپے گز ملتی تھی۔ میں نے پندرہ بیس روپے اور قرض لے لوا کر لال رنگ کی ساڑی خرید ہی لی۔ اب بارڈر کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں۔ میں نے سوچا چلو گوٹا ٹانک لیں گے۔ وہ دو تین روپے میں مل جائے گا۔ یوں ہو گئی میری لال ساڑی تیار۔ اماں نے اجازت دے ہی دی تھی۔ جیسے وہی ایک پردہ پارٹی ہوئی میں سرخ ساڑی پہن کر وہاں پہنچ گئی۔ میری بہن Savoy ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ بھی پارٹی میں آئیں۔ اور مجھے دیکھا لال ساڑی میں، دھیمی آواز میں ڈانٹنا شروع کیا کہ بڑی بے شرم ہو۔ لال ساڑی پہن کر آئی ہو۔ کس نے اجازت دی تمہیں میں نے آہستہ سے کہا ''اماں نے'' اماں تو بہت سیدھی ہیں۔ تمہیں سوچنا چاہیے کہ بڑی معیوب بات ہے۔ میں ان کے پاس سے ہٹ کر اور خواتین میں جا بیٹھی لیکن میری بہن جب جب میرے نزدیک ہوئیں تو کچھ نہ کچھ تادیب کرتی ہی رہیں۔ میں بھی بڑی ڈھیٹ تھی۔ اپنے ڈھنگ پر جمی رہتی تھی۔ اس ساڑی کی واردات پھر یہ ہوئی کہ میری بہن نے الماری سے لال ساڑی غائب کر کے اس پر کامدانی بنوائی۔ اور میری جہیز کی ساڑیوں میں شامل کر دی۔ میری انا کو بڑا سخت دھکا پہنچا ہو گا۔

لکھنؤ میں میرے ابا نعمت کالج کے کمپونڈ کی چھوٹی کوٹھی میں رہتے تھے۔ بڑی کوٹھی کے نصف حصے میں بیگم آل رضا رہتی تھیں۔ ان سے میری بہن کی بڑی دوستی تھی۔ وہ جسٹس محمد رضا کی بڑی بہو تھیں۔ اور آل رضا صاحب ایڈوکیٹ کی بیوی۔ اپنی بہن کے ساتھ میں بھی بیگم آل رضا سے ملی۔ گھر ہم لوگوں کے قریب قریب تھے۔ آنا جانا بڑھا۔

بیگم آل رضا بڑی محبتی عورت تھیں چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں اور ان کے چھوٹے موٹے مسئلوں میں بھی دلچسپی لیتیں۔ ہمدردی کا اظہار کرتیں اور ہو سکتا تو انہیں سلجھا بھی دیتیں۔ دریا دل بھی تھیں جب دیکھو کوئی تحفہ دے رہی ہیں یا مزے دار کھانے کی چیزیں ان کے یہاں سے آ رہی ہیں۔ خود بھی بے تکلفی سے آتیں اور میری والدہ کے پاس فراغت سے بیٹھی رہتیں۔

ہم لوگ بھوپال سے آئے تھے۔لکھنو میں ہمارے جاننے والے بہت کم تھے چنانچہ یہ میل ملاقات سب کو اچھی معلوم ہوتی۔

میں دو پہر میں ایک چادر اوڑھ کر بھابھی جان کے یہاں پہنچ جاتی۔ فاصلہ مشکل سے سوگز کا ہوگا۔ایک دن یہ خبر ملی کہ میری نسبت آئی ہے۔جسٹس رضا کے تیسرے صاحب زادے کے لیے جن کا نام عباس رضا ہے اور جو جوڈیشیل سروس میں منصف ہیں۔منصفی عہدے کو بعد میں بدل کر Civil Judge کر دیا گیا۔ منصفی میں قدرے کمتری کی بو آتی تھی۔

میں نے سنا تو بہت گھبرائی۔ میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتی رہتی تھی۔میری یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دو اجنبیوں کو اس قدر قربت کے رشتے میں کیسے جوڑ دیا جاتا ہے۔چنانچہ میں نے فوراً اپنے والد کو خط لکھا کہ میں اور آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ پیانو سیکھنا چاہتی ہوں اور میں شادی کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ چار صفحوں کا خط لکھا جس کی مجھے کبھی رسید نہیں ملی۔شادی بیگم علی ظہیر اور بیگم آل رضا نے طے کی تھی۔ میرے والد کو ۱۹۳۰ء میں مسوری میں دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور وہ بے حد فکر مند تھے کہ کسی طرح اپنی بیٹی کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہو جائیں۔انہیں اور میری بہن کو خوب معلوم تھا کہ میں کھلے دل کی شوخ اور شریر لڑکی ہوں۔کھیل کود میں جی لگتا تھا۔کورس کی کتاب چھوڑ کر دوسری کتابیں بے حد پڑھتی۔ ناولیں، عام جانکاری کی کتابیں،مشہور و معروف لوگوں کی سوانح عمریاں یہاں تک کہ فلسفے کی کتابوں سے بھی شوق رکھتی تھی۔Hume کو پڑھا کرتی تھی۔ سمجھ میں زیادہ نہیں آتا تھا لیکن دلچسپی تھی۔ پیانو سیکھنا بھی شروع کیا تھا اور ہاکی کھیلنے بھی جاتی تھی۔ اب اس معجون مرکب لڑکی کو کہیں ٹھکانے لگانا آسان نہیں تھا۔اور اس کا معمول یہ تھا کہ اچھے خاندان کا لڑکا ہو۔نوکری بھی بھلے قسم کی ہو۔ ہاتھ پیر کا اچھا ہو۔سید ہو اور بس۔

عباس رضا صاحب ان تمام شرائط پر پورے اترتے تھے۔میرا خط نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گیا۔اور ۱۴ر نومبر ۱۹۳۲ء کو میرا نکاح بہ وقت مغرب عباس رضا سے کر دیا گیا۔

اس رات میں ساری رات روئی تھی۔اور صبح شدید درد سر لے کر اٹھی تھی۔اس سے پہلے میرے سر میں کبھی درد نہیں ہوا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے ایک مشاعرے میں چلمن کے پیچھے سے ایک صاحب کو دیکھا جن کے بارے میں ایک خاتون بول اٹھیں کہ دیکھو دیکھو ایک انگریز شیروانی پہنے ہوئے ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں صاحب سے میرا نکاح ہوا ہے۔وہ بہت گورے تھے۔

دسمبر سے ۵ر فروری تک کے عرصے میں عباس رضا نے مجھے چند خط لکھے جن میں اظہار محبت ہوتا تھا۔ جواب میں میں نے انہیں لکھا کہ آج کل میں فلاں ناول پڑھ رہی ہوں۔

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس' کے شمارے پڑھے جا سکتے ہیں۔صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جا سکتا ہے۔

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

یادیں

مغل سلطنت کے خاتمے کے بعد وائسرائے سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان پر ہماری حکومت ہے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ باٹ تھے۔ان کا انتخاب رائل فیملی سے ہوتا تھا یا رائل فیملی کے قریبی دوستوں یا ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں میں سے ہوتا تھا۔ وائسرائے کے ساتھ ان کی بیویاں پہلے تو ہندوستان آنے سے گھبراتی تھیں۔بعض Vicerines ایسی بھی ہوتی تھیں جو ہندوستان آنا چاہتی تھیں یہاں کی آب و ہوا یہاں کے مخلص اور محبت کرنے والے لوگ انہیں پسند تھے۔ وائسرائے کی طرح Vicerines کے بھی سکریٹری ہوا کرتے تھے وہ ملٹری سے لیے جاتے تھے اور جو A.D.C. ہوتے تھے وہ مختلف محکموں سے آتے تھے۔ پرنسپل سکریٹری کو Vicerines کی پسند نہ پسند کا پورا پورا دھیان رکھنا پڑتا تھا۔ پکوان، دعوت نامے، وسائل آمدورفت، جلسے تقاریب وغیرہ یہ سب کام پرسنل سکریٹری ہی دیکھا کرتے تھے۔

اس زمانے میں ہندو مسلم تہذیب میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ اکثر ہندو گھرانوں میں مرد شیروانی ہی پہنتے تھے۔ مسلم خواتین ساڑیاں ہی پہنتی تھیں۔

ہندوستان کے States کے وائسرائے سے اچھے روابط ہوا کرتے تھے۔ وائسرائے صرف اپنے لاج ہی سے حکومت نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ہر جگہ جاتے پرائویٹ کے والیوں سے ملتے جہاں ان کی بڑی آو بھگت ہوتی تھی۔ ہماری شہزادیاں اور راج کماریاں اپنے شاہانہ ڈریس اور قیمتی زیورات میں سجی دھجی ان سے ملا کرتی تھیں۔Vicerine کی آمد پر وہ خود ان کا استقبال کرتی تھیں ۔وائسرائے اور وائسرن کی آمد پر فوجی پریڈ ہوتی جس میں ہاتھی گھوڑے ہوتے اور ان کے کمالات دکھائے جاتے تھے ان چیزوں کا وائسرائے پر بڑا اچھا اثر پڑتا تھا۔ڈانس وغیرہ کا اہتمام بھی ہوتا تھا اور یہ شہزادیاں وائسرن کے ساتھ ڈانس میں بھی حصہ لیتی تھیں۔

ہندو مسلم اور یورپین خواتین کے میل جول کی روایت لیڈی ولنگڈن کی مرہون منت ہے۔Lady Wiillingdon بڑی پُر جوش غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ ممبئی اور مدراس کے قیام کے دوران با وقار اور ذمہ دار خوب صورت خاتون میز باں کے فرائض انہوں نے انجام دیئے۔ مہمانوں کے لیے مختص کیے گئے کمروں کی خود دیکھ بھال کرتی تھیں حتیٰ کہ مہمانوں کے ملازمین کی ضروریات اور ان کے کمروں کی بھی خبر رکھتی تھیں جب وہ کینیڈا میں تھیں تو مغرب اور مشرق کے خوب صورت حسین اور رنگا رنگ تہذیبی امتزاج کے لیے مشہور تھیں وہاں کے اخبارات نے ان کی ان صلاحیتوں پر بڑے اچھے Writeup لکھے تھے۔

جب ولنگڈن ہندوستان وائسرائے بن کر آتے تھے تو لارڈ منٹو نے ان پر بڑا دلچسپ ریمارک کیا تھا کہ وائسرائے جیسے اہم عہدہ کے لیے اس Oldest Personality کا انتخاب کیا گیا ہے۔ لیڈی ولنگڈن نے منٹو کے اس ریمارک کا تو کوئی جواب نہیں دیا مگر اپنے بارے میں انہوں نے کہا کہ وہ اب بھی انتہائی صحت مند چاق و چوبند ہیں۔ ہندوستان کا موسم انہیں پسند ہے اور اس موسم نے ان پر کوئی گرانی نہیں کی۔

سرکاری یا غیر سرکاری تقاریب میں وہ بہترین ڈریسنگ نفیس زیورات میں لبوں پر مسکراہٹ لے کر شرکت کرتی تھیں۔1934ء میں اک کتاب لارڈ ولنگڈن کی زندگی پر منظر عام

پر آئی تھی جس کا Title تھا "Lord Willingdon in India" اس میں مصنف نے یہ اعتراف کیا تھا کہ لیڈی ولنگڈن اپنے جادوئی حسن، حسن انتظام اور مدرانہ اور تنظیمی صلاحیتوں کی وجہ سے دہلی، ممبئی اور مدارس میں ولنگڈن سے زیادہ مقبول رہیں۔ طبی تعلیمی اور سماجی میدانوں میں لیڈی ولنگڈن نے کئی اہم کام انجام دیئے۔ ممبئی کے مقام کے دوران وہاں موبائیل ہاسپٹل چلاتے تھے۔

لیڈی ولنگڈن کے علاوہ دیگر Vicerien نے بھی ہندوستانی خواتین کو ان کے محلات کی محدود دنیا سے نکال کر سماجی اور اصلاحی پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی Lady Dufferin نے ہندو اور مسلم خواتین کے امتیازی فرق کو مٹا کر انہیں، India Women سے مخاطب کیا Lady Dufferin کی یہ بھی کوشش رہی کہ وہ ہندوستانی خواتین سے وقتاً فوقتاً ملاقات کرتی رہیں تاکہ ان میں جرأت خود احتسابی اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ 1930ء کے بعد آنے والی Viceriens نے بھی ایسی ہی پابندی کی آپسی میل جول بڑھایا۔

ہندوستان کی آخری وائسرن Lady Mountbatten نے تو ان خواتین کو ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لیے اکسایا۔ سروجنی نائیڈو اور وجے لکشمی پنڈت ان ہی کی وجہ سے سیاست میں آئیں یہ بھی سچ ہے کہ ان خواتین کا خاندانی پس منظر بھی سیاست سے گہرا تعلق رکھتا تھا لیڈی ماونٹ بٹن کی وجہ سے انہیں اور تقویت ملی۔

برٹش خواتین اور ہندوستانی خواتین کے آپسی تال میل کے باوجود ان میں ایک حد فاصل بھی ہوا کرتا تھا۔ ہندوستانی خواتین کا ایک خصوصی اجتماع ہوا کرتا تھا وہ ''پردہ پارٹی'' کہلاتا تھا۔ ایسی پارٹی کی ابتداء بیسویں صدی کے اولین دہوں میں زاہد سہروردی نے اپنے کلکتہ کے محل میں کی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ یورپین وائسرین اور ہندو مسلم خواتین کی ایک ہی پلیٹ فارم پر ملاقات ہوتی تھی۔ اس پردہ پارٹی میں Lady Gleen Elliot، Lady Baker بنگال کے گورنر کی بیوی نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ کلکتہ کی ایک خوش گوار دوپہر تھی۔ یورپین خواتین نرم و نازک سفید لینن گے گونس میں تھیں۔ سر پر خوب صورت نقش Hat پہنے ہوئے تھے۔ ہندوستان مرد اور خواتین میں مہارانی کوچ بہار (Maharani Coach Behar)، مہارانی Mathore، مہاراجہ چندر موہن، ٹیگور، سلطان سنگھ، مہاراجہ Vlwar اور والئی بھوپال سلطان کیخسر و جہاں نے شرکت کی تھی۔ یہ خواتین حقوق نسواں کے لیے بے حد مضطرب تھیں اور کچھ نہ کچھ کام کیے جاتی تھیں۔ 'سلطان کیخسر و جہاں'' نے بھوپال میں تعلیمی نسواں کو بہت فروغ دیا۔ انہیں مالی اعتبار سے خود مکتفی بنانے کے لیے بڑی جدو جہد کی، مدرسے قایم کیے گھریلو صنعت و حرفت کو آگے بڑھایا۔ وہ آل انڈیا ویمنس ایجوکیشن کانفرنس کی پہلی صدر تھیں۔ علی گڑھ یونورسٹی کی یہ اولین چانسلر بھی رہیں۔ والئی بھوپال کے علاوہ اودھ اور میسور کی شہزادیاں سینئر برٹش آفیسر کی بیویاں اور Cornelia Sorabji ایڈوکیٹ تھیں۔

''پردھ پارٹی'' کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی شاندار سنہری جھالر دار شامیانے لگے ہوئے تھے۔ خوب صورت ترین صوفوں اور کرسیوں سے شامیانے سجے تھے۔ ٹھیک وقت پر Vicerine کی گاڑیاں آ پہنچی مسز سہروردی نے استقبال کیا۔ دیدہ زیب سفید سلک پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا تھا اور اس اڈریس پر فنکشن میں موجود معزز خواتین کی دستخطیں تھیں۔ ہ اڈریس بیگم مرشد آباد نے ہاتھی دانت کے دیدہ زیب صندوقچہ میں رکھ کر Vicerine کو پیش کیا۔ آج بھی ہمارے جلسوں میں وہی انگلش Tradition زیادہ نظر آتا ہے سوائے پابندئ وقت کے۔

☆☆☆

نور الحسنین

افسانہ

نئے موسموں کی دستک

جب سے میرا بڑا بیٹا وشواس میرے پوتے وشال کے ساتھ امریکہ سے واپس آیا ہے میرے گھر کا ماحول ایک دم خوش گوار ہو گیا ہے۔ ہر دن پارٹی اور ہر رات دیر گئے تک گپ شپ۔ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ، عمدہ پکوان تیار ہو رہے ہیں عزیز و رشتہ داروں کی دعوتیں ہو رہی ہیں۔ اُس نے خاندان کے ہر فرد کے لیے کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور لایا ہے۔ مجھ پر تو وہ جیسے واری جا رہا ہے۔ ہر دم میری خدمت میں حاضر رہتا۔ اُس نے پہلی ملاقات ہی میں سارے بہن بھائیوں اور بہوؤں کو صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ بھگوان وشنو نے کہا ہے کہ جس نے اپنے پتا میں مجھے سمجھا اور اُس کی دل سے خدمت کی میں اُس کی ہر پرارتھنا کو قبول کرتا ہوں۔ اوپنشد میں لکھا ہے اے بھگتو ایشور کی پوجا سے پہلے اپنی ماں باپ اور گرو کی پوجا کرو۔ اس بات کو سمجھو۔۔۔ اب ہماری آخری پونجی ہمارے پتا جی ہی ہیں اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ تمھیں وہ آخری نفع حاصل ہو جس کہ بارے میں تم کچھ نہیں جانتے تو سنو۔ پتا جی کی دل جان سے سیوا کرو۔ اُن کی کاٹھی میں کوئی فرق نہ آئے۔ اُنھیں اچھی سے اچھی خوراک دو۔ باقی بھگوان پر چھوڑ دو کہ وہ اپنے بھگتوں کے گمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

وشواس کے یہ وچار جب بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں میرے روم روم سے اُس کے لیے آشرواد کی ایسی جھڑی لگتی ہے مانو ساون بھادوں کا مینھ برس رہا ہو۔۔ یہی تو وہ وچار ہیں جس کی وجہ سے میرا ہر طرح سے خیال رکھا جا رہا ہے۔ منجلی بہو باقاعدگی سے مجھے بادام کا حریرہ بنا کر دے رہی ہے۔ چھوٹی بہو جب جب بھی بازار جاتی ہے میرے لیے پھل ضرور لاتی ہے مجھے بار بار تاکید کی جا رہی ہے کہ میں رات کو جلدی سو جایا کروں اور صبح کم از کم چار میل تک پیدل چلا کروں۔ میں بھی اُن کی خوشی کی خاطر وہ سب کچھ کر رہا ہوں جو وہ چاہتے ہیں۔ وشواس نے امریکہ سے بلڈ پریشر ناپنے کا آلہ لے آیا ہے۔ میں نے اُس سے کہا بھی کہ بیٹا مجھے کوئی بیماری نہیں لیکن پھر بھی

چھوٹا بیٹا روی پابندی سے بلڈ پریشر چیک کرتا ہے۔ اُن سب کا یہ برتاؤ دیکھ کر میرا دل بھر آتا ہے اور بے اختیار میرا متھا تصور ہی میں بھگوان کے چرنوں میں جھک جاتا ہے اور میری زبان سے نکلتا ہے کہ ہے بھگوان میری جیسی اولاد سب کو دے۔

آج کل میں اپنے دوستوں کی محفلوں میں زیادہ بیٹھنے لگا ہوں اور اُن کے سامنے اپنی اولاد کی جی بھر کر تعریفیں کرنے لگا ہوں۔ میری ہر بات پر اُن کا منہ حیرت سے کُھل جاتا ہے۔ کچھ تو یقین کرتے ہیں اور کچھ محض اولاد کی بڑائی تصور کرتے ہیں لیکن جب اُن کی سانسوں سے جلنے کی بدبو اُٹھتی ہے تو میں کچھ زیادہ ہی بولنے لگتا ہوں۔

میرے بڑھاپے کی کتاب کے اوراق دن بدن سنہرے ہوتے جا رہے تھے۔ آج بھی معمول کے مطابق نہیں بلکہ بچوں کی ہدایت کے باعث میں رات دس بجے ہی بستر پر لیٹ گیا اور اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ کچھ دیر کے بعد مجھے کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو میں نے بدن کو ایک دم ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے گہری نیند سو رہا ہوں۔ میری بیٹی کمرے میں داخل ہوئی، یہ جاننے کے لیے کہ میں واقعی سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں، آہستہ اُس نے مجھے آواز دی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک بار اُس کی آواز سنائی

دی ۔میں اُسی طرح چپ چاپ لیٹا رہا، پھر اُس نے میرے آنکھوں پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ کو دھکا دیا اور میں نے ہاتھ نیچے گرا دیا۔ میں چور نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ پھر اُس نے میرے پلنگ کا جائزہ لیا ۔میرے تکیے کے نیچے سے ہنومان چالیسی کی کتاب نکالی ۔اُس کے اوراق پر نظریں ڈالیں ۔کتاب کو وہیں رکھ دیا اور میرے پائنتی سے کمبل اُٹھائی، ادھر اُدھر دیکھا اور پھر اُسے میرے بدن پر ڈال دیا ۔کمرے کی لائٹ کو آف کیا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی، کیا یہ صرف اس اطمینان کے لیے آئی تھی کہ میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں؟ یا پھر کوئی خاص بات مجھے بتانا چاہتی تھی۔؟ وہ کونسی بات ہوسکتی تھی؟ اگر ایسی کوئی بات تھی تو اُس نے مجھے اُٹھایا کیوں نہیں؟ آخر وہ کیا چاہتی تھی؟ کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی رات کو میرے کمرے میں نہیں آئی تھی۔ میرے آنکھوں سے نیند اُچٹ گئی۔ میں بہت دیر تک اپنی ہی سوچوں میں اُلجھتا رہا ۔اور آخر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا گلہ بھی سوکھنے لگا تھا۔

پانی کی خاطر جیسے ہی میں کمرے سے باہر نکلا اور زینہ اُترنے لگا مجھے منجلے بیٹے ششی کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے قدم سیڑھی پر ہی جم گئے۔ میرا بڑا بیٹا کہہ رہا تھا، ''وہ تو ہے۔۔۔ ہمارے پتاجی بہت بھولے بھالے انسان ہیں۔ ارے اُن کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میں اُنھیں امریکہ لے جانا چاہتا ہوں تو وہ پلین سے تو کیا پیدل بھی چلنے کو راضی ہو جائیں گے۔''

''لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا تو۔۔۔؟ '' یہ میری بیٹی کی آواز تھی۔

'' وہ انکار نہیں کریں گے۔'' وشواس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

'' خیر یہ تو آپ کا اور پتاجی کا معاملہ ہے، ہمیں کیا۔۔۔لیکن یہ بتا دیں آپ ہمارے لیے کیا کرنے والے ہیں ۔ '' ششی کی آواز میں ایک تجسس تھا۔

''وقت پر سب کچھ بتا دوں گا۔بس اتنا سمجھ لو کہ اس میں سب کا فائدہ ہے۔''

سچ ہی تو کہہ رہا ہے وشواس۔۔۔میں بھلا امریکہ جانے سے کیوں انکار کروں گا۔۔۔۔ میں تیزی سے زینہ اُتر گیا ۔۔۔اُس کے اس محبت بھرے ارادے کو بھلا میں کیسے خاک میں ملنے دوں گا؟ اور پھر یہاں بھی تو وہ سب کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے والا ہے۔ مجھے اپنی گھٹیا سوچ پر گھن سی آنے لگی تھی۔۔۔میرے بچوں نے ہمیشہ ہی میرا بھلا چاہا ہے البتہ وشواس کی بات الگ ہے ۔۔۔ وہ تو ہمیشہ ہی مجھ سے دور دور رہا۔۔۔کبھی اپنی پڑھائی کی وجہ سے اور کبھی اپنی نوکری کے سبب ۔۔۔اُسے میری خدمت کا موقع ہی کہاں ملا تھا؟ اب وہ جی جان سے میری خدمت کرنا چاہتا ہے ۔۔۔اسی لیے تو امریکہ لے جانے کی بات کر رہا تھا۔۔۔میرے بچے میرے لیے کتنے اچھے خیالات رکھتے ہیں اور میں اُن پر شک کر رہا تھا کہ میری بیٹی میرے کمرے میں کیوں آئی تھی؟ اُسے ضرور وشواس ہی نے بھیجا ہوگا، جو بھی ہو۔۔۔لیکن اُس نے جس محبت کے ساتھ مجھے کمبل اُڑائی تھی۔۔۔میں وہ سب کچھ بھول گیا؟۔۔۔ میری ساری بے کلی غائب ہوگئی۔ میں نے پانی پیا اور سکون کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔۔۔کل میں یہ بات اپنے دوستوں کو ضرور بتاؤں گا کہ میں تو اب امریکہ جانے والا ہوں۔

میرے امریکہ جانے والی بات سن کر میرے دوستوں نے پھر اُسی حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

''یار کمل کانت تم واقعی نصیب والے ہو کہ اسی جیون میں امریکہ بھی دیکھ لوگے۔'' سرفراز میاں کا ہاتھ اُن کے سر پر پہنچا اور وہ اپنی ٹوپی کو درست کرنے لگے۔

''مگر یار لوگ تو کہتے ہیں کہ امریکہ جانا ہو تو جوانی میں جانا چاہیے۔ !''سورج مل نے ایک آنکھ دبا کر سب کی طر دیکھا،''گوری گوری نیم برہنہ چھوکریوں کی کمر جب لشکارے مارتی ہے تو آدمی اپنے آپ کو اِندر کی سبھا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔''

موہن بابو نے کمل کانت کی پیٹھ پر ہاتھ مارا،'' اپنا دوست بھی تو اب صرف اِندر کی سبھا دیکھنے کے ہی لائق رہ گیا۔''

سب کے لبوں سے قہقہہ بلند ہوا۔

''دوست کمل کانت ایک بات کہوں۔۔۔؟''سب نے سوامی کی طرف دیکھا،'' مجھے غلط نہ سمجھو۔۔۔بھگوان نہ کرے کہ یہ تمہارے ساتھ ہو۔''

''کیا۔۔۔؟''سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا

''میں نے سنا ہے کہ وہاں گھریلو کام کاج کے لیے نوکر نہیں ملتے۔اور ملتے بھی ہیں تو اُن کی اُجرت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ یہاں سے جانے والے وہ برداشت نہیں کر پاتے۔یہ بات مجھ سے بہت سارے لوگوں نے بتائی ہے اور میں نے ایسی بہت ساری کہانیاں بھی پڑھی ہیں کہ اکثر لوگ یہاں سے اپنے ماں باپ کو بہلا پھسلا کر وہاں لے جاتے ہیں اور اُن کو نوکر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔''

سب کے چہروں پر سناٹا چھا گیا۔

اور پھر سب نے ایک ساتھ کمل کانت کی طرف دیکھا تو وہ ہکلانے لگا،'' نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔میرے ساتھ ایسا بالکل نہیں ہوگا۔وہ۔۔۔میرا۔۔۔بیٹا۔۔۔وہ تو وہاں کا۔۔۔مشہور آرکی ٹیکٹ ہے۔کافی آمدنی ہے اُسے۔۔۔یقین رکھو میرے دوستوں میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''ہاں یار۔۔۔تمہاری اولاد تو بے حد فرمابردار ہے۔''سرفراز میاں نے اپنے سر سے ٹوپی اُتاری اور بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگے تھے۔

لیکن جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کے جیسے میں فرشی دھوتے ہوئے بیٹھا ہوں۔

''کمل کانت ہمارے ملک کی تہذیب اور اخلاقیات مغرب سے بہت مختلف ہیں۔''سدھا کرنے بھی اپنی زبان کھولی،'' تمہارا بیٹا کئی برسوں سے امریکہ میں رہ رہا ہے۔وہاں کے ماحول کا کچھ تو اُس پر بھی اثر ہوا ہوگا۔''

مجھے لگا جیسے میں اوپر کے کام کاج کرنے والا چھوکرا ہوں اور باورچی خانے کے سامنے پلیٹ تھامے کھڑا ہوں۔

''اس لیے جانے سے پہلے اپنے بیٹے کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیں۔آخر اتنے برسوں کے بعد اچانک وہ تم کو امریکہ کیوں لے جانا چاہتا ہے۔''سدھا کرنے اپنی بات مکمل کر لی۔

میری عجیب سی حالت ہو گئی تھی۔میں کبھی اپنے کسی دوست کی طرف دیکھتا اور کبھی دوسرے دوست کی طرف۔مجھے بے چینی سی ہونے لگی اور آخر میں وہاں سے اُٹھ گیا اور اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگا۔میری آنکھوں میں میرے عجیب وغریب روپ نظر آنے لگے تھے۔کبھی دل گواہی دیتا میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔میرا بیٹا کس قدر میرا خیال رکھتا ہے۔وہ اتنا خودغرض نہیں ہو سکتا کہ مجھ سے ملازموں کی طرح سلوک کرے۔میں نے اُس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔اُسے انگلش میڈیم سے پڑھایا۔تنخواہ کا بڑا حصہ ہمیشہ اُس پر ہی خرچ ہوا جبکہ دوسرے بچوں کو میں نے مادری زبان ہی میں تعلیم دلوائی۔کیا وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے؟ لیکن جواب میں پھر ایک بار وسوسوں نے مجھے گھیر لیا۔۔۔۔

میں اسی تذبذب کے عالم میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا،گھر میں عجیب سی چہل پہل تھی۔مجھے دیکھتے ہی وشواس دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اُس نے نہایت محبت سے میرا ہاتھ تھاما،

''پتاجی آپ کہاں چلے گئے تھے۔آپ کی صحت، طاقت اور لمبی عمر

کے لیے میں نے مرتیوانجائیہ منتر کے جاپ کے لیے پنڈتوں کو بلایا ہے ۔چلیے ہال میں سب آپ کی پرتکشا کر رہے ہیں۔'' میرا منہ حیرت سے کھلا کہ کھلا رہ گیا۔ میں اُس کی طرف دیوانوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔کیا یہ مجھے امریکہ لے جا کر نوکروں کی طرح برتاؤ کرے گا؟لیکن اُس کی آنکھوں سے بے پناہ محبت اور عقیدت چھلک رہی تھی۔ بے اختیار میرے ہاتھ اُس کی گردن میں حمائل ہو گئے اور میں پوری شدت کے ساتھ اُس سے لپٹ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات گھنگھور گھٹاؤں کی طرح برس جانا چاہتی تھی لیکن میں نے جذبات کی آندھیوں کو وائیو دیوتا کی طرح روک لیا۔ میں اُس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکا اور اُس کے ساتھ ہال میں داخل ہو گیا۔

وشواس کی کوششوں سے میرا پاسپورٹ بھی بن گیا تھا اور اب میرا امریکہ جانا بالکل یقینی ہو چکا تھا۔ میں اپنے آپ کو نفسیاتی اُلجھنوں میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔اس لیے میں نے اب دوستوں کی محفل میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا، بلکہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو ایک نئے ماحول کے لیے تیار کرنے میں لگ گیا تھا۔

زندگی نہایت پُرسکون گزر رہی تھی۔صبح ہوتے ہی میں جنگلوں کی طرف نکل جاتا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سنتا۔ندی کے اٹھلاتے ہوئے پانی کے گیت سنتا اور ہر روز اُن سب کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا گویا آخری بار دیکھ رہا ہوں۔کبھی من اُداس ہو جاتا اور کبھی آتما سیر ہو جاتی۔اس کے علاوہ کبھی نزدیک اور دور کے رشتے داروں سے ملنے چلا جاتا، وہ عجیب حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے۔اُس وقت میری گردن ابھیمان سے کچھ اور ہی اونچی ہو جاتی اور میں اپنے بیٹے کی تعریفوں کے پل باندھنے لگتا۔اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں اور مجھے عجیب طرح کا سکون میسر آتا۔

پورے شہر میں میری خوش قسمتی اور وشواس کی سعادت مندی کا چرچا تھا۔اس پر بھی میرے کچھ قریبی رشتہ داروں کے منہ سے دھواں اُٹھا کہ اس عمر میں باپ کو امریکہ لے جانے کے بجائے تیرتھ یاترا کرتا تو پونیہ کا کام ہوتا۔ جب یہ بات وشواس کے کانوں تک پہنچی تو میں نے اُس سے کہا تھا، بیٹے جتنے منہ اُتنی باتیں۔تم ان پر دھیان نہ دو۔بس اپنا کام کرو۔

اور وشواس دن رات اپنے کام میں جٹ گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ، میرے پلین کا ٹکٹ اور ویزا بھی آ گیا اور دوسرے دن گیارہ بجے ہماری فلائٹ تھی۔تمام رشتہ دار اور دوست احباب پھر ایک بار مجھے مبارکباد دینے میرے گھر پہنچ گئے۔خوب ہنگامہ رہا ۔آخر میں تھکا ہارا اپنے کمرے میں پہنچا کہ اپنی پیٹھ سیدھی کر لوں۔ ابھی میں پلنگ پر لیٹا ہی تھا کہ میری بیٹی اور چھوٹا بیٹا روی میرے کمرے میں داخل ہوئے۔اُن کے چہروں پر عجیب سی اُداسی تھی۔ وہ دونوں ہی بنا پلک جھپکائے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں فوراً اُٹھ بیٹھا۔ دونوں کی حالت دیدنی تھی ۔میں نے دونوں کو اپنے سینے سے لپٹا لیا اور آہستہ سے کہا،'' اُداس کیوں ہوتے ہو۔میں واپس آؤں گا۔''

میرے یہ الفاظ سنتے ہی دونوں ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے۔ میں اُنھیں سمجھانا ہی چاہتا تھا کہ وشواس آ گیا اور اُس نے دونوں کو مجھ سے الگ کرتے ہوئے بولا،'' یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ۔اپنے جذبات سے پتاجی کو کمزور کر رہے ہو۔ میں اُنھیں ایک نئی دنیا کے سفر پر لے جا رہا ہوں۔''

اُس کے یہ الفاظ پھر ایک بار اُن کی آنکھوں میں آنسو بن کر بہنے لگے۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اُن کے جذبات نے زبان کو جکڑ لیا تھا۔وشواس نے سختی سے اُن کے ہاتھوں کو پکڑا اور کمرے سے باہر لے کر چلا گیا۔اُن کی اُداس لیکن بے بس آنکھیں میری آنکھوں میں اُتر آئیں۔ میں خود بھی بہت جذباتی

ہو گیا تھا لیکن امریکہ جانا جیسے میرا مقدر بن گیا تھا اور جب مقدر بن جاتا ہے تو پھر کوئی بھی اُس سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ہمیشہ کی طرح میرے پوتا پاتی نواسے نواسیوں نے مجھے کہانی سنانے کے لیے گھیر لیا تھا۔ میں اُن کو رام چندر جی کی کہانی سنا رہا تھا کہ محض باپ کی ایک غلطی کی وجہ سے اُنھیں چودا برس تک اپنے شہر سے دور جنگلوں میں بن باس کاٹنا پڑا تھا تو اچامک میرے تیرا برس کے پوتے وشال نے سوال کیا تھا، ''دادا جی ہم کو بھی آپ کی وہ غلطی بتا دیں جس کی وجہ سے میں میرے ڈیڈی، ممی امریکہ میں اتنے برسوں سے بن باس کاٹ رہے ہیں؟''

میں نے اپنے پوتے کی طرف محبت سے اور اُس کے سوال پر حیرت زدہ ہو کر دیکھا اور سوچنے لگا۔۔۔ کیا اپنی حیثیت اور اپنی خواہشات کو مار کر اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانا غلطی ہے؟ ظاہر ہے یہ بات میں اپنے پوتے کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا، '' یہ میری غلطی نہیں تھی میرے بچے، بلکہ یہ میری بڑی خواہش تھی کہ میرا بیٹا بہت مشہور آرکی ٹیکٹ بنے اور ملک سے باہر جا کر خوب روپیہ کمائے تا کہ تم سب آرام وسکون کی زندگی بسر کر سکو۔''

وشال کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور وہ لمحے بھر ہی میں نیو یارک پہنچ گیا تھا۔ ممی اور ابو صبح اُٹھنے کے بعد شاید ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھتے تھے تو میری شکل کیا دیکھتے۔ ایک باتھ روم میں ہوتا تو دوسرا ناشتے کے ٹیبل پر، میں کچھ کہنا چاہوں تو مجھے جواب ملتا، شام کو۔۔۔ شام کو۔۔۔ اور جب شام کے بجائے رات گہری ہو جاتی تو وہ دونوں لڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے۔ ایک دوسرے کو کھانے پینے کی چیزوں کا نشانہ بناتے۔ ایک دوسرے پر گر جتے اور پھر اپنے بیڈ روم میں چلے جاتے کسی کے پاس وہ وقت ہوتا ہی نہیں تھا کہ بیٹے سے پوچھیں کہ اُس نے کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔ تنخواہ دار آیا ہی میری ماں کی گود تھی، وہی وہ میٹھی مسکراہٹ تھی، جو کبھی بھوک اور پیاس کا مداوا تھی، اُسی کی محبتوں نے مجھے ممتا کی ٹھنڈک سے آشنا کیا تھا، وہی میرا کھلونا تھی، وہی میرے آنسو پوچھتی تھی اور وہی میری خوشیوں کا محور تھی۔ پچھلے مہینے ہی کی تو بات ہے جب مجھے اسکول سے بہترین کھلاڑی کی ٹرافی ملی تھی اور میں خوشی خوشی اُس کے سینے سے لگا تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ڈیڈی جیسا بڑا ہو گیا ہوں۔ غالباً اُسے بھی یہی اندازہ ہو گیا تھا اور تنخواہ دار ملازمہ نے مجھے اپنے سے الگ کیا تھا۔ اُس کا چہرا اُداس ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے ہمارے گھر کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

میں اُس کے چہرے کی ہر بدلتی ہوئی تصویر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اپنی ہی سوچوں میں پتہ نہیں جذبات کے کن جزیروں میں بھٹک رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اُسے آواز دی، '' وشال۔۔۔۔''

'' دادا جی کیا رام چندر جی دوبارہ اپنے وطن واپس آ گئے تھے۔؟'' اُس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں۔۔۔ ہاں واپس آ گئے تھے۔''

اُس کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جس میں آنسو بھی شامل تھے۔ بے اختیار میں نے اُسے لپٹا لیا، حالانکہ اُس کی اندرونی کیفیات مجھ پر واضح نہیں تھیں لیکن اُس کے بدن کی تھرتھراہٹ کسی اندرونی کرب کا شدید احساس دلا رہی تھی۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، '' بیٹے تمہارے ڈیڈی بھی ایک دن بہت سارا روپیہ کما کر ہمیشہ کے لیے یہاں آ جائیں گے۔ وہ تو وہاں کے ایک بڑے آدمی ہیں۔ آرکی ٹیکٹ ہیں۔''

''وہ آرکی ٹیکٹ نہیں ہیں۔'' وہ میرے سینے سے الگ ہوا، اور آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا، '' وہ

اور مما ایک فیکٹری میں کلرکی کرتے ہیں۔

''کیا۔۔۔؟؟؟'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے زمین کو گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا، '' دادا میرے ڈیڈی اپنی یہاں کی ڈگری کو وہاں کے لیول پر کوالی فائی نہیں کر سکے۔ اُنھوں نے کئی بار کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ہم وہاں پر سب سے معمولی کالونی میں رہتے ہیں۔۔۔۔۔''

مجھے دھچکا سا لگا۔ خواب وشواس کا نہیں میرا ٹوٹا تھا۔

وشال پتہ نہیں اور کیا کیا بیان کر رہا تھا۔۔۔۔

اور میں اپنے وقت اور زندگی کی ساری کمائی کو اُس ناکارہ تعلیمی نظام کے بھینٹ چڑھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا جو محض کاغذ کے ایک ٹکڑے کی صورت وشواس کے ہاتھوں میں پہنچی تھی۔ اس بے جان کاغذ کے ٹکڑے کے لیے میں نے اپنی کتنی ہی خواہشات کو قتل کیا تھا۔ کتنی ہی اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹا تھا۔ مجھے زندگی کا ایک ایک پل یاد آنے لگا تھا پھر میری سوچ کے دائرے جب پھیلے تو میں نے کتنے ہی پُل اُدگھاٹن سے پہلے ہی گرتے ہوئے دیکھا، کتنے ہی مریضوں کو غلط تشخیص کے سبب مرتے ہوئے پایا، کتنے ہی ڈیم کی دیواروں میں وقت سے پہلے دراڑوں کی رپورٹیں پڑھیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں کب نیند کے حوالے ہوا مجھے پتہ ہی نہیں چلا اور یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ میں کب سے سو رہا تھا۔ جب جاگا تو بچے میرے پاس سے کب کے جا چکے تھے۔ کمرے کی لائٹ آف تھی۔ ششی کے روم سے آہستہ آہستہ باتوں کی آوا میں آ رہی تھیں۔ جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے گمان ہوا، ضرور وہ سب میرے ہی بارے میں گفتگو کر رہے ہوں گے۔ میں خوشی خوشی پلنگ سے اُٹھا اور زینہ اُترنے لگا کہ اُن کے باتیں سن سکوں۔ کچھ سیڑھیاں ہی اُترا تھا کہ وشواس کی آواز میرے کانوں میں واضح ہوگئی۔ میں وہیں پر رُک گیا۔ وہ کہہ رہا تھا، '' میں پتاجی کو امریکہ کیوں لے کر جا رہا ہوں۔۔۔ میرا منصوبہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں وہ سب کچھ اپنے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ تم سب کا بھی بھلا ہوگا۔ یہ نئے وچاروں اور پرمپراؤں کے درمیان ایک طرح کا یدھ ہے۔ بھگوان کرشن نے کہا ہے کہ یدھ کبھی سماپت نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے کال بدلے گا یدھ کے کارن بھی بدلیں گے۔ جیون سوئم ایک یدھ ہے اور یدھ میں آدرش ٹوٹتے ہیں اور ہر یدھ ایک پتامہا کی بلی چاہتا ہے۔ امریکہ ایک ایسا دیش ہے جہاں انسان کے جسم کا ایک ایک انگ منہ مانگے داموں میں بکتا ہے۔''

میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔

''اور اپنے پتاجی کی کاٹھی تو اب بھی زبردست ہے۔''

ششی نے لقمہ دیا تھا۔

میرے ہاتھوں کی پکڑ زینے کی ریلنگ پر مضبوط ہوگئی۔

''بھیا یہ کام کب تک ہو جائے گا؟''

روی تم بھی۔۔۔؟۔۔۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ روی۔۔۔ تم جو دن کی روشنی میں ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے دل پر گہری ضرب لگی۔ میرا پورا بدن کانپنے لگا تھا۔

''یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ بس وہاں ایک بار پتاجی کا بیمار ہونا نہایت ضروری ہے۔''

میرے دماغ کی رگیں سکڑنے لگیں۔ مجھے چکر سے آنے لگے۔ پورا گھر میرے اطراف تیز اور تیز گردش کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا میرے جسم کا ایک ایک انگ ہوا میں منتشر ہوتا جا رہا ہے۔ تبھی میں نے اپنی لاڈلی بیٹی کی آواز سنی، '' بھیا اس بار ہمارے حصے کا بھی خیال رکھنا۔۔۔''

میرا دماغ سن ہوگیا اور اس سے پہلے کہ میں زمین پر گر پڑتا میں ریلنگ کے سہارے سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

محمد یحییٰ جمیل

افسانہ

واپسی

زمین اپنے محور پر گھومتے ہوئے، وندھیا چل اور ست پڑا کے درمیانی جنگل میں، شام کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اچانک کسی چیز کے تڑخنے کی آواز آئی اور پاس ہی لیٹا ہوا کتا ڈر کر بھاگا۔ کچھ دور جا کر وہ پلٹا اور آواز کی سمت منھ کر کے زور زور سے بھونکنے لگا۔ جنگل کے سناٹے میں کتے کی آواز چند منٹوں تک گونجتی رہی اور پھر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

چناوی مہم اپنے عروج پر تھی۔ چار، پانچ روز بعد ووٹ ڈالے جانے تھے۔ ساجد ایک سوشلسٹ نظریے کے حامی اخبار میں نامہ نگار تھا۔ فسطائی طاقتیں چناو میں پورا زور صرف کر رہی تھیں۔ ساجد، ریاست کے سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ لیتے لیتے تھک چکا تھا۔ نائب مدیر احمد کمال سے اس نے کہا، 'بہت ہوا، دو روز کہیں گھوم آتا ہوں۔'

'میں بھی انسان ہوں۔' کمال نے کہا۔

'شادی کرنے کا ارادہ ہے؟' ساجد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا۔

کمال چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر کرسی سے ٹیک لگا کر بولا، 'تم آفس سنبھالو، میں چھٹی پر جاؤں گا۔' ساجد اس بات پر بوکھلا گیا۔ 'ارے نہیں نہیں بھائی، تم بھی چلو بلکہ سیما کو بھی ساتھ لے لیں گے۔' اس نے کہا۔ کمال کو نامہ نگار سیما سے انسیت تھی جسے محبت بہر حال نہیں کہا جا سکتا تھا، لیکن ساجد سب کچھ جانتے ہوئے بھی اکثر مذاق کرتا رہتا۔

'ہاں، اس میز کو، اس کرسی کو، بلکہ اس آفس کو بھی پیک کروا کر ساتھ لے لیتے ہیں۔' کمال بولا۔

'ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔' ساجد نے ہنس کر کہا۔

'پروگرام کیسا ہے؟' کمال نے پوچھا۔

'وہ ابھی طے نہیں ہے۔ لیکن چھٹیاں...'

'بہت مشکل ہے ساجد صاحب، پھر بھی چلو، باس سے بات کر لیں۔' کمال اٹھتے ہوئے بولا اور دونوں مدیر کے کیبن کی طرف بڑھ گئے۔

'یہ کوئی وقت ہے چھٹی لینے کا؟' مدیر نے جھنجلا کر کہا۔

کمال کے دماغ میں بجلی چمکی۔ 'سر مجھے ووٹ ڈالنے کے لیے گاؤں جانا ہی ہے، سوچتا ہوں اگر ساجد کو بھی ساتھ لے لوں تو بھیم بیٹکا کے انتخابات پر ایک اسٹوری ہو سکتی ہے۔'

'بہتر ہے۔' مدیر نے بیزاری سے سر ہلایا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ چونکہ اسٹاف بہت تھا اس لیے مدیر نے اجازت دے دی۔ دونوں کیبن سے نکل گئے۔

'پھنسا دیا تم نے۔'

'بچا لیا فرزند۔'

'لیکن خوب سن لو، کام تم کرنا۔ میں صرف آرام کروں گا۔' ساجد نے کہا۔

'بالکل' کمال بے نیازی سے بولا۔ اسے بھیم بیٹکا کی سیر ہمیشہ مرغوب رہی تھی۔

'پروگرام کیسا ہے؟' ساجد نے پوچھا۔ پھر قہقہہ لگا کر بولا، 'خدا کی قدرت۔' کمال مسکرانے لگا۔ نغمہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

'دیکھیے مس نغمہ، دس منٹ پہلے یہ مجھ سے پوچھ رہے تھے، پروگرام کیسا ہے۔ اور اب یہی بات میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ ہائے

ہاے، ہاے جیک کرلی میری چھٹیاں۔'

'بھوپال۔' کمال نے سگار سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ 'کل صبح نکلتے ہیں۔'

'میں نے شاید بھیم بیٹکا جیسا کچھ سنا تھا۔' ساجد کان کھینچ کر بولا۔

'بھوپال سے بھیرو پور، ستلا پور، سمرئی، عبیداللہ گنج اور بھیم بیٹکا۔ یہ ہے پروگرام۔' کمال نے دھنویں کا مرغولا چھوڑا۔

ساجد اب سر کھجانے لگا۔ نغمہ بے اختیار ہنس پڑی۔

دوسرے دن دونوں بھوپال پہنچے اور شام ہوتے ہوتے وہ کھڑی اور بکھری چٹانوں کے بیچ ساگوان اور سال کے درختوں سے گھرے سرسبز و شاداب علاقے میں تھے، بھیم بیٹکا میں۔ ساجد نے سال کا درخت پہلی بار دیکھا تھا۔

'یہ سال کا درخت ہے، اسے سکھوآ بھی کہتے ہیں۔' کمال نے بتایا، 'ہندو عقیدے کے مطابق بھگوان وشنو کو یہ پیڑ بہت عزیز ہے۔'

'تو وہ بھی آتے ہوں گے یہاں، گھومنے...' ساجد مسکرایا۔

'ہاں، کہتے ہیں آٹھ بار تو آ چکے۔'

نومبر کا مہینہ تھا اور سردی کافی بڑھ چکی تھی۔ قیام کے لیے کمال نے ایک بہتر ہوٹل چنا تھا۔ انھوں نے رات کا کھانا کھایا اور گھوڑے بیچ کر سو گئے۔

اگلے روز، کمال، حسب معمول علی الصبح بیدار ہوا اور چونکہ ساجد نے آرام کا فیصلہ کر رکھا تھا اس لیے اکیلا ہی بھیم بیٹکا کی گپھاؤں کی طرف نکل گیا۔ ہر جگہ انتخابات کی دھوم تھی۔ ساجد سارا دن کمرے میں کاہلی سے پڑا رہا۔ وہ باری باری کبھی موبائل اور کبھی ٹی وی دیکھتا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی کمرے ہی میں منگوالیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دو تین گھنٹے سوتا رہا اور شام میں نہا دھو کر کمال کا انتظار کیے بغیر مارکیٹ گھومنے نکل پڑا۔ کمال نے اخبار کے لیے مواد جمع کیا اور رپورٹ اور تصویریں اخبار کو ای میل کر دیں۔

رات میں جب وہ کھانے کی میز پر ملے تو ساجد نے پوچھا، 'کیا کہتے ہیں ارباب علم، بارے ان گپھاؤں کے؟'

'نیوز رپورٹ کا نہیں پوچھو گے؟'

'وہ کیا ہوتی ہے؟' ساجد نے بڑا سا منھ کھول لیا۔ کمال نے سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لے کر بولا، 'آج زیادہ گھوم نہیں سکا، تاہم سنو، برصغیر ہند پر انسانی رہایش کے یہ اولین نقش ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ کچھ غار ہوموایریکٹس (Homo erectus) کے ہو سکتے ہیں جو تقریباً ایک لاکھ سال قبل یہاں رہے ہوں گے۔'

ساجد آنکھیں پھیلائے کمال کی باتیں سننے لگا۔

'ان غاروں میں انسانی رقص کے بھی ابتدائی ثبوت موجود ہیں۔'

'اور تصویریں؟'

'ہاں راک پینٹنگ (Rock paintings) تقریباً تیس ہزار سال پرانی ہیں۔'

'حجری عہد کی!' ساجد نے دھیرے سے کہا۔

'ہاں..... لیکن غاروں میں جو تصویریں ہیں وہ کسی ایک زمانے کی نہیں ہیں۔ یہاں انسان ہزار ہا سال رہتا رہا اور مختلف زمانوں میں تصویریں بناتا رہا۔ یہاں ڈاکیومینٹیڈ ہسٹری تک بڑی دلچسپ تصویریں ہیں۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ یہ راک پینٹنگز آسٹریلیا کے سوا نا علاقے میں پائی جانے والی تصویروں سے اور فرانس کی آدی باسی راک پینٹنگز سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں۔'

'واقعی.....!!'

'ان غاروں میں شکار سے کاشتکاری تک اور پھر منظم شہری بننے تک انسان کی مصوری کے نمونے ہیں۔'

ساجد کی آنکھوں میں حسرت دیکھ کر کمال بولا، 'فکر مت کرو، یہاں تقریباً ۵۰۰ مصوّر غاریں ہیں۔'

'پانچ سو.....!' ساجد کا منھ کھلا رہ گیا۔

'مگر سیاحوں کے لیے صرف بارہ/۱۲ ہی غاریں کھلی ہیں۔' کمال نے اسے تسلی دی۔

'پھر مابدولت کل تشریف لے چلیں گے۔' ساجد نے گردن اونچی کر کے کہا۔

'ان غاروں کی قسمت کھل جائے گی حضور۔' کمال نے بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔

چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ویٹر انھیں عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ساجد نے اسے اشارے سے بلایا اور اسی لہجے میں آرڈر لکھانے لگا۔ کمال اب مسکرانے لگا تھا۔

روم پر ساجد نے کیمرے کی تصویریں دیکھیں۔ یہ تصویریں سرخ، سفید، پیلے اور ہرے رنگوں سے مزین تھیں، اور ان کی آؤٹ لائن باریک برش سے بنائی گئی تھی۔ کمال نے بتایا کہ وہ ٹہنیوں کے ریشوں کو برش کی طرح استعمال کرتے تھے۔ ساجد کو شاید مغل منی ایچر قسم کی تصویروں کی توقع تھی وہ کچھ مایوس ہو کر بولا، 'بھائی ایسی تصویریں تو میں بھی بنا سکتا ہوں۔ بے ڈھنگی۔'

کمال زور سے ہنسا، پھر وہ دیر تک غاروں کی تصویر کشی پر گفتگو کرتا رہا۔

ساجد صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو گیا۔ کمال نے بھی ضروری سامان لیا اور وہ گپھاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھومتے گھومتے انھوں نے سیاحوں سے انٹرویو بھی کر لیا۔ تقریباً چار بجے وہ ہوٹل واپس پہنچے۔ کھانا کھانے کے بعد ساجد بستر پر دراز ہو گیا اور کمال بھی صوفے پر لیٹ گیا۔

پھر ساجد کمرے کی گھنٹی بجنے پر ہی اٹھا۔ کمرہ پوری طرح تاریک تھا۔ اس نے جلدی سے لائٹ آن کیا، گھڑی میں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ دروازہ کھولا تو سامنے کمال مسکرا رہا تھا۔

'ارے.....! تم سوئے نہیں تھے؟ کہاں چلے گئے تھے؟؟' ساجد نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

'مقامی امیدواروں سے انتخابات پر بات کرنے نکل گیا تھا۔' کمال اپنا بیگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا، 'چلو کھانا کھالیں، زوروں کی بھوک لگی ہے۔' ساجد اس کے اسٹیمنا کی داد دیتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

آج بھیم بیٹکا میں ان کا تیسرا دن تھا۔ کمال نے ساجد سے کہا، 'کل شام میں عبیداللہ گنج کے لیے نکل چلیں گے اور...'

'اور اگلے روز ووٹ ڈال کر شہر واپس۔' ساجد نے جملہ مکمل کر دیا۔

'تمھارے گھر پہلی مرتبہ چل رہا ہوں، کمال صاحب، ڈھنگ کا کھانا کھلانا.....'

چونکہ انھیں جنگل میں واقع کچھ گپھائیں دیکھنی تھیں اس لیے انھوں نے ہوٹل سے دوپہر کا کھانا پیک کروالیا اور نکل پڑے۔ کل کی طرح ساجد آج بھی پورے جوش سے کمال کے ساتھ نکلا۔ وہ جنگل میں پہنچے اور گپھاؤں کی تفصیل نوٹ کرنے لگے۔ پھر ایک پیڑ کے نیچے انھوں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور ساجد ستانے کے لیے قریب ہی واقع ایک چھوٹے سے ٹیلے پر لیٹ گیا۔ 'دیکھو قدرت نے ہمارے لیے ٹیلے پر سبزہ بچھا رکھا ہے۔' ساجد بولا۔ کمال خاموشی سے سگار پیتا رہا۔ ساجد نے آگے کہا، 'اور برگد کے پتے سورج کی شعاعوں سے ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔ اور چڑیاں.....؟ یہاں کوئی پرندہ نہیں ہے۔' وہ چونک کر بولا۔

'ہاں، عجیب بات ہے۔ پیڑوں کے علاوہ یہاں کوئی اور متنفس نہیں ہے۔' کمال نے دھیرے سے کہا۔

ساجد نے سامنے کھڑی چٹان کو غور سے دیکھا۔ اس کا نچلا حصہ کم چوڑا اور اوپری حصہ پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اس چٹان کی طرف اشارہ کر کے کمال سے کہا، 'دیکھو یہ چٹان تنگ بنیادی کے باوجود کتنی

مضبوطی سے کھڑی ہے۔'

'بنیاد گہری ہوگی۔' کمال نے اطمینان سے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد کمال بولا، 'یہ چٹان بھارت کے نقشے سے کتنی ملتی ہے نا؟'

لیکن ساجد کو نیند لگ چکی تھی۔ کمال خاموش ہوگیا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گذر گیا۔

'چلو یار، کچھ تصویریں لے لیں پھر نکلتے ہیں۔' کمال نے ساجد کو دھکا دے کر کہا۔

ساجد جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، اور اس کا دھوپ کا چشمہ جو سینے پر رکھا تھا، لڑھک کر ایک طرف پھسلتا چلا گیا۔

'کیا گرا؟' اس نے پوچھا۔

'تمھارا گاگل، وہ اس طرف ہے۔' کمال نے اشارہ کیا۔

ساجد نے انگڑائی لی اور گاگل اٹھانے کے لیے جونہی جھکا اسے ایک درار نظر آئی۔ اس نے اندر جھانکا اور پھر حیرت سے کمال کی طرف پلٹ کر بولا، 'اندر کیا ہے؟'

کمال سراپا سوال بنا اسے دیکھ رہا تھا۔

'دیکھو.....' ساجد نے اشارہ کیا۔

کمال نے آگے بڑھ کر اس درار سے اندر دیکھنے کی کوشش کی تو پایا کہ وہ ایک کشادہ غار ہے اور اس کی دیوار پر ایک روشن تصویر بھی ہے۔

'یہ تو مصوّر غار ہے۔' کمال کی سانسیں تیز ہوگئیں۔

'مصوّر غار!!' ساجد حیران تھا۔

'یہ اَن نوٹسڈ غار معلوم ہوتی ہے۔' کمال نے گپھا میں بدستور جھانکتے ہوئے کہا۔ 'مگر اب تک اَن نوٹسڈ کیسے رہی؟'

'ممکن ہے یہ درار اب بنی ہو۔' ساجد کی بات پر کمال نے حامی بھری۔ 'چونکہ یہ برگد کے پیڑ سے قریب ہے اس لیے بایولاجیکل ویدرنگ (Biological weathering) اس کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔' ساجد نے آگے کہا۔

'ہوں..... برگد کی بروہوں نے اس چٹان کو تڑخا دیا ہوگا۔' کمال بولا۔

'لیجیے، ہم نے بھیم بیٹکا میں نئی مصوّر غار کھوج لی۔' ساجد زور سے ہنسا۔

'ہزاروں سال بعد اس غار کا رشتہ دوبارہ اس دنیا سے قائم ہورہا ہے۔' کمال بولا۔

کچھ فاصلے پر موجود ایک خارش زدہ کتا رونے لگا۔ 'لیجیے، یہ متنفس آ گیا' ساجد نے کہا اور ایک ڈھیلا کر مار کر اسے بھگا دیا۔

'چلو اس کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔' ساجد نے کہا۔

'زمین کے اندر ہے یہ غار، راستہ کہاں ملے گا؟' کمال بولا اور ساجد نے بھاگ چکے کتے کی سمت پھر ایک ڈھیلا اچھال دیا۔

'یوں لگتا ہے جیسے غار کو کسی نے دفن کر دیا ہو؟' ساجد نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔

'تم اپنے موبائل سے کچھ تصویریں لے لو۔ کیمرے سے تصویریں لینا مشکل ہے۔' کمال اس کے ڈرامے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ساجد نے آگے بڑھ کر اپنے موبائل فون سے تصویریں لے لیں۔

زرد سورج سال کے درختوں کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔

'ہم کل دوبارہ آجائیں گے۔' کمال نے کہا۔

'یعنی آج واپسی ملتوی۔' ساجد نے اپنے جیکٹ کی زپ کھینچ لی۔

'ظاہر ہے۔' کمال نے بھی گلے میں مفلر لپیٹ لیا۔

'پھر ووٹنگ.....؟'

'دیکھتے ہیں۔' کمال نے سوچتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد جب وہ ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو ساجد نے موبائل کو لیپ ٹاپ سے جوڑا اور تصویریں ڈاؤن لوڈ کر لیں۔ پھر

وہ اطمینان سے تصویریں دیکھنے لگے۔ مگر وہ تصویریں اطمینان سے دیکھنے والی نہیں تھیں۔ تصویریں چونکہ درار سے لی گئی تھیں اس لیے بہت آڑی ترچھی آئی تھیں تاہم سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ یہ ایک ہی تصویر تھی لیکن بڑی مفصل اور انتہائی خوفناک۔

'عجیب تصویر ہے۔' ساجد نے کہا۔

'اگر ممکن ہوا تو ہم کل اندر اترنے کی کوشش کریں گے۔' کمال بولا۔

'ہوں.....' ساجد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں اپنی اپنی رضائیوں میں دبک گئے۔

دوسرے دن تقریباً نو بجے وہ اسی جگہ موجود تھے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ سامان بھی لے آئے تھے، جس کی مدد سے اس گپھا کی درار کو چوڑا کرنے کا منصوبہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔

'آج انتخابات ہیں، لوگ ووٹ ڈالیں گے، خدا کرے زیادہ بارش نہ ہو۔' ساجد نے کہا اور ایک سلاخ سے درار کو چوڑا کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کی محنت کے بعد تڑخی ہوئی چٹان کا ایک ٹکڑا ڈھیلا پڑا جسے دونوں نے مل کر بدقت تمام کھینچ لیا۔ کچھ مٹی اندر گر پڑی۔ بادلوں کی وجہ سے سورج کی کرنیں زمین پر نہیں پڑ رہی تھیں۔ البتہ ملگجی روشنی تو تھی ہی۔ گپھا کا نظارہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ واضح دکھائی دینے لگا۔

'اوہ یہ تو پوری طرح کھل گیا، ہم دونوں ساتھ چھلانگ لگا سکتے ہیں۔' کمال نے کہا۔

'نہیں، پہلے تم ہی اترو۔' ساجد نے کہا۔

کمال نے اندر پیر لٹکائے، ساجد نے سہارا دیا اور کمال بروہ پکڑ کر نیچے کود گیا۔ اس کے پیچھے ساجد بھی اتر گیا۔ یہ غار تقریباً ۱۰×۱۵ کی رہی ہوگی۔ اندر پر ہول اور پراسرار سناٹا طاری تھا۔ ساجد اور کمال کو اپنی ہی سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ غار میں عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

'شاید چوہے وغیرہ اس میں آتے جاتے ہوں گے۔' کمال نے دھیرے سے کہا اور اس کی آواز غار میں گونج گئی۔

'تصویر دیکھو۔' ساجد نے دھیرے سے کہا۔

کمال نے تصویر پر نظر ڈالی۔ کالی چٹان پر ایک انتہائی خوفناک انسانی چہرہ بنا ہوا تھا، اس کی آنکھیں سرخ اور دانت کسی درندے کی طرح لمبے اور نکیلے تھے۔ دانتوں کے گرد کھنچی، سرخ رنگ کی آؤٹ لائن انھیں وحشتناک بنا رہی تھی۔ جسم سانڈ کا تھا جس پر زرد رنگ سے لمبے لمبے بال بنائے گئے تھے۔ گویا یہ سنہری عفریت ہو۔ اس کے بھاری کھروں کے نیچے بے شمار انسان دبے ہوئے تھے۔ وہ سانڈ ایک آدمی کو بے رحمی سے کھا رہا تھا۔ تصویر اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ اس نصف خوردہ جسم کا سرخ خون چمکنے کی وجہ سے بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ساجد کو جھرجھری آ گئی۔

'یہ عفریت شاید ریڈیم سے بنایا گیا ہے۔' ساجد نے زبردستی مذاق کیا۔ 'بہت ایڈوانس معلوم ہوتے ہیں سالے۔'

'ھششش.....' اسے ایک آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً کمال کی نہیں تھی۔ ساجد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تو کیا یہ سانپ کی پھنکار تھی۔ وہ قدرے کمال کے نزدیک ہو گیا۔

'یہاں سانپ بھی ہو سکتے ہیں؟' ساجد نے سوال کیا۔

'غضب کی تصویر ہے۔' کمال اس کی بات پر دھیان دیے بغیر دلچسپی سے بولا۔ 'اس تصویر کے لیے انھوں نے کس طرح کے رنگ استعمال کیے ہوں گے؟'

'کچھ دیر کے لیے باہر نکلو، حبس ہو رہا ہے۔' ساجد بولا، اسے کمال کے جملے زہر لگ رہے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے دونوں جڑیں پکڑ کر اوپر نکل گئے۔ اوپر نکلتے ہوئے ساجد کو یوں محسوس ہوا جیسے اندر کوئی سایہ ڈول رہا ہو۔ اس کا گلا خشک ہو گیا۔ باہر نکل کر اس نے

گہری سانسیں لیں اور بوتل کھول کر پورا پانی پی گیا۔کمال نے بھی اپنی ایک سگار کم کر لی۔آسمان پر بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے اور روشنی بڑھنے لگی تھی۔

'اگر ہم جلد نکل جائیں تو تم ووٹ ڈال سکو گے ورنہ مشکل ہے۔' ساجد نے کہا۔

'ہاں، ہاں کوشش کرتے ہیں۔' کمال بولا۔

'چلو اب تصویریں لے لیتے ہیں۔' کمال نے کہا۔

'ہنھ، اب صرف تم اتر کر تصویر کھینچ لو۔' ساجد نے اپنے خوف کو بیزاری میں چھپانے کی کوشش کی۔کمال اطمینان سے اندر اترا لیکن کیمرہ سنبھالتے ہی وہ چکرا گیا۔'یہ کیا؟' اس نے برخلاف عادت زور سے کہا۔

'کیوں کیا ہوا؟' ساجد نے تشویش سے پوچھا۔

'یہ تصویر دھندلی پڑ رہی ہے۔' وہ بولا۔

'شاید روشنی کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ باہر آجاؤ۔' ساجد بولا۔

'ایک طریقہ ہے۔تم اسے اوپر سے ڈھانپ دو۔اندر اندھیرا ہوگا تو تصویر پھر نظر آئے گی۔' کمال نے کہا۔

'پاگل ہو گئے ہو، میں کہتا ہوں، باہر آجاؤ۔' ساجد نے تقریباً چیخ کر کہا۔

'اوپر بیگ وغیرہ کچھ رکھ دو۔کچھ نہیں ہوگا۔'

ساجد نے کسی طرح اسے ڈھانپ کر اندر اندھیرا کر دیا لیکن تصویر کا دھندلا ہونا جاری رہا۔کمال بری طرح حیران تھا۔کیا سورج کی معمولی شعاعوں سے اس کے رنگ اڑ رہے تھے؟ لیکن دوسری غاروں میں ہزاروں سال سے تصویریں موجود ہیں۔کسی غار میں ایسا نہیں ہوا۔پھر یہ تصویر کیسے دھندلی پڑ رہی ہے؟

تبھی ہلکی ہلکی پھنوار پڑنے لگی۔'اف..... بارش!' ساجد چیخا۔اس نے ہاتھوں سے سر ڈھانپا اور کسی درخت کے نیچے جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے کھڑی اونچی چٹان پر پڑی۔اس چٹان پر غار والی تصویر ابھر رہی تھی۔ساجد بھونچکا رہ گیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے.....؟؟

چٹان پر تصویر واضح ہوتی چلی تھی۔

'ساجد تصویر پوری طرح غائب ہو چکی ہے۔' کمال اندر سے بولا، 'میں باہر آتا ہوں، ہاتھ دو۔' ساجد نے اس کی مدد کی اور جب کمال باہر نکل آیا تو ساجد نے کانپتے ہوئے اسے چٹان پر بنی تصویر دکھائی۔کمال نے حیرت اور مسرت کے ساتھ اسے دیکھا اور بولا، 'گھبراؤ مت یار، یہ بارش یعنی پانی کی وجہ سے بنی ہے۔'

'مجھے بچہ سمجھتے ہو؟'

'ارے بھائی یہ ایک تکنیک ہے، لیکن ہزاروں سال پہلے بھی ہوگی .....؟

'اب بس کرو پلیز۔' ساجد بولا۔

'نہیں میں مذاق نہیں کر رہا۔ بلڈانہ ضلع میں ایک مسجد ہے جس کی دیوار پر پانی ڈالنے سے قرآنی آیات دکھائی دیتی ہیں۔'

'پھر اس چٹان کے اطراف پھیلی ہری گھاس کیسے جھلس گئی؟ اب ہمیں لوٹ جانا چاہیے، پلیز۔' ساجد بیچارگی سے بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں تاحد نگاہ بادل چھا گئے اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔تیز ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے وہ دونوں ہوٹل کی طرف واپس ہو رہے تھے۔ ساجد بالکل خاموش تھا۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ساجد کی دلجوئی کے لیے کمال نے اسی کے انداز میں کہا، 'شاید یہ بادل بجلیوں کے چابک سے زمین کی کھال کھینچ لیں گے۔' مگر ساجد نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔اس کے کانوں میں پراسرار آوازیں گونج رہی تھیں۔

ہوٹل پہنچنے تک ساجد کو تیز بخار چڑھ چکا تھا۔اسے

کمرے میں لٹا کر، کمال، ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد دوا لکھ دی اور آرام کا مشورہ دیا۔ باہر تیز بارش شروع ہوگئی۔ کمال وقفے وقفے سے دن بھر ساجد سے باتیں کرتا رہا لیکن ساجد کی زبان گویا تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ کمال کو اس بات پر حیرت تھی کہ بیبا کی سے حالات کا تجزیہ کرنے والا نامہ نگار اتنے کمزور اعصاب کا مالک نکلا۔

رات میں ساجد ٹھیک سے سو نہیں پا رہا تھا۔ جب بھی آنکھ لگتی وہ خود کو اسی غار میں موجود پاتا۔ پریشاں خوابی سے زچ ہو کر اس نے موبائل اٹھالیا۔ وھاٹس ایپ چیک کیا، فیس بک دیکھا اور پھر تصویروں کا فولڈر کھول لیا۔ اس میں غار کی تصویریں تھیں۔ ساجد نے پایا کہ غار کی تصویروں سے بھی وہ عفریت غائب ہے۔ سخت سردی میں اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا۔ وہ کمال کو بتانے کے لیے اپنے بستر سے اٹھا اور غش کھا کر وہیں گر پڑا۔ اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو اس نے پایا کہ کمال اس کے سرہانے بیٹھا ہے اور ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا ہے۔

ساجد سرگوشی کے لہجے میں بولا، 'کمال، وہ عفریت موبائل سے بھی غائب ہے۔'

ڈاکٹر سوالیہ انداز سے کمال کو دیکھنے لگا۔ کمال نے کسی طرح بات ٹال دی اور اس کے جانے کے بعد موبائل میں تصویریں چیک کیں۔ پھر لیپ ٹاپ میں دیکھیں۔ غار کی تمام تصویروں سے وہ پراسرار عفریت غائب تھا۔ کمال ہونٹ بھینچ کر معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

دو دن بعد جب وہ اپنے شہر پہنچے تو کمال نے ساجد سے معذرت طلب کی کہ اس کی وجہ سے ساجد کو اس قدر پریشانی ہوگئی۔ ساجد نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی، لیکن اسے بھی افسوس تھا کہ وہ خوامخواہ کمال کے ساتھ گیا۔

پندرہ دن بعد انتخابات کے نتیجے آ گئے۔

جب کمال، ساجد سے ملنے اس کے گھر پہنچا تو صبح کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ ساجد اب تک سو رہا تھا۔ اس کی والدہ نے روکنے کے باوجود ساجد کو جگا دیا۔ کمال کچھ بجھا بجھا ساجد کے کمرے میں داخل ہوا اور تازہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ ساجد نے سرورق پر نظر ڈالی اور چیخ مار کر اخبار پھینک دیا۔

'کیا ہوا؟؟' کمال نے پوچھا۔

'کمال، اخبار میں یہ کیا چھپا ہے؟'

'ساجد، ہم نے عوام کو بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن اب کیا کر سکتے ہیں۔ یہی نتائج ہیں۔'

'نتائج گئے چولہے میں بھائی۔ اس کے پہلے صفحے پر غار والا عفریت کیوں ہے.....؟' ساجد ہذیانی انداز میں چیخا۔

ساجد کی بات سن کر کمال کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

☆☆☆

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

بی بی رضا خاتون

مضمون

صفیہ اختر کے خطوط مشرقی نسائی حسّیت کے آئینہ دار

صفیہ اختر مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کی شریک حیات ،مجاز لکھنوی کی بہن اور دورِ حاضر کے معروف نغمہ نگار اسکپر ٹ رائٹر جاوید اختر کی ماں کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ان کے خطوط کے مجموعے ''حرفِ آشنا'' اور ''زیرِ لب'' اپنی ادبی سماجی اور تہذیبی اہمیت کے پیش نظر اُردو ادب کے سرمایہ کا نہ صرف بیش قیمتی حصّہ ہیں بلکہ مشرقی نسائی حسّیت کے آئینہ دار بھی ہیں۔آج کل Feminism کے نام جو افراط وتفریط کی فضا بنی ہوئی ہے اور مغرب کی اندھی تقلید اور Radical Feminism کی تائید مضر اثرات مرتب کرتے ہوئے مشرقی تہذیب اور اقدار کو نقصان پہنچا رہی ہے۔مغرب میں اخلاق واقدار کی شکست وریخت ،ازدواجی زندگیوں میں بکھراؤ ،ذہنی تناؤ ،انسانی رشتوں میں بے اعتمادی ،نفسیاتی امراض وجرائم وغیرہ سماج کو انحطاط کی طرف لے جانے میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ Radical Fiminism بھی شامل ہے۔

خواتین پر ہونے والے مظالم،استحصال،زیادتیوں اور صنفی امتیازات کو ختم کر کے ان کے وجود اور تشخص کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں بھی بحیثیت انسان اور بحیثیت شہری مساوی حقوق دینے پر زور دینا تانیثیت ہے۔لیکن آزادی کے نام پر اخلاق و اقدار کو داؤ پر لگا دینا بے راہ روی، بے اعتنائی ،رشتوں کی بے حرمتی اور ذمہ داریوں سے چشم پوشی جیسی درآمدات سے ہمیں گریز کرنے کی ضرورت ہے۔ہمارے اپنے ادبی سرمایے میں مشرقی نسائیت سے متعلق بہت متعدل اور صحت مند مثالیں موجود ہیں۔جن میں صفیہ اختر کے خطوط اہمیت کے حامل ہیں۔ان خطوط کے آئینہ میں صفیہ اختر ایک مشرقی خاتون کا ایسا عکس پیش کرتی ہیں جس میں ایک وفا شعار بیوی، مربی ومشفق ماں ،ہمدرد بہن ،معلم حیات ،سکھ دکھ کے ساتھی زندگی کے جدو جہد میں قدم بہ قدم جاں نثار اختر کے ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔صفیہ اختر مشرقی تہذیب کے صالح عناصر کی علمبردار ہیں۔وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ،ملازمت پیشہ خاتون تھیں ،معاشی طور پر اپنے خاندان کو Support کرتی ہیں لیکن انھوں نے اسے اپنی خود نمائی اور خود بینی بننے نہیں دیا۔اپنی خوش اسلوبی سے تمام معاملات کو بخوبی سنبھالتی نظر آتی ہیں۔

جاں نثار اختر گوالیار میں پیدا ہوئے تھے ان کی اعلی تعلیم اور ادبی زندگی کا آغاز علی گڑھ میں ہوا۔ان کی شادی صفیہ سے ۲۵/ دسمبر ۱۹۴۳ کو ہوئی۔صفیہ بارہ بنکی کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں جو معاشی طور پر خوشحال ، وضع دار ، مہذب اور روشن خیال خاندان تھا۔اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد صفیہ نے مسلم گرلس کالج علی گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔شادی کے بعد چار سال تک ملازمت کے سلسلہ میں جاں نثار اختر گوالیار میں مقیم رہے۔کچھ عرصہ دونوں حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبۂ اردو و فارسی میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔وہاں سے جاں نثار فلم میں کریئر بنانے کے لئے ممبئی چلے گئے۔جاں نثار اختر اور صفیہ اختر فرائض منصبی کی ادائیگی کے سبب دونوں الگ الگ شہروں میں رہتے تھے لیکن خط و کتابت سے ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔صفیہ خطوط کے ذریعہ جاں نثار کو ذہنی رفاقت ،قلبی سکون اور زندگی کی ہر مشکل سے آسانی سے گزر جانے کے گُر سے آشنا کراتی ہیں۔ان کے یہ احساسات و جذبات انفرادی ہوتے

ہوئے بھی آفاقیت کے حامل ہیں۔وہ بے روزگاری کے زمانے میں بھی جاں نثار اختر کی جس خلوص سے ہمت بڑھاتی ہیں وہ ایک مشرقی خاتون کا شیوہ ہوسکتا ہے جس کو رشتوں کا پاس ولحاظ ہے۔وہ شوہر کے وقار اور عزتِ نفس کو دنیا کی کسی بھی نفع پر ترجیح دیتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''اور خود کو کسی طرح متاثر نہ کرنا۔اچھے برے وقت سب گزر جاتے ہیں۔پریشانی کا مقابلہ عزم اور استقلال سے کرنا اخلاقی بلندی کی دلیل ہے۔جذباتی طور پر اپنی بے روزگاری کا صدمہ نہ لے بیٹھنا۔ظاہر ہے اگر تم چاہو تو تمہاری ٹھاٹھ دار ملازمت آج بھی تمہاری منتظر ہے لیکن یہ تو اپنی Choice کا سوال ہے اس پر خود ہی جی کو کڑھانا کیسا؟''

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''بہر حال تم اپنے دل ودماغ کو زیادہ متاثر نہ کرو اب تک جو کچھ ہوا وہ ہم سب کی بہتری کے لیے ہوا اور آئندہ بھی جو کچھ ہوگا وہ بہتر ہوگا۔خلوص اور نیت کی صداقت یہ دو چیزیں انسان کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا کرتیں۔جو کچھ مادی و افادی پہلو نہ نکلے تو کردار کی برتری تو ہاتھ سے نہیں جاتی اختر!''

صفیہ اختر کے ادبی ذوق،تنقیدی شعور،فہم وفراست ،نکتہ فہمی اور سوجھ بوجھ کے سبب انھیں جاں نثار اختر نے اپنا Intellectual Campanion قرار دیا۔اُردو شاعری کی روایت میں عورت کے حسن وادا سے متاثر ہو کر شعر کہنے کی روایت تو عام ہے لیکن اس کی ذہانت وفطانت اور سلیقہ مندی سے متاثر ہو کر اس کی دانشوری سے روشنی حاصل کر کے شعر کہنے کی مثال تو نایاب ہے۔خصوصاً ہندوستانی تناظر میں عورت کا مرد کی زندگی میں یہ مقام ومرتبہ حاصل کر لینا بڑی بات ہے۔اس سے قبل عورت کا کیا مقام ومرتبہ رہا ہے ہم سب اس سے واقف ہیں۔جاں نثار اختر صفیہ اختر کو ہندوستان کی نئی عورت کا عکس قرار دیتے ہوئے خدیجہ اختر (دوسری بیوی) ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آج کی عورت کو تم کوئی سستا کردار نہ سمجھو وہ بلند ہے اور پاکیزہ ،کل کی بہ نسبت زیادہ با شعور اور سماج کے لیے زیادہ مفید عورت کے بارے میں رسکن Ruskin نے کہا تھا کہ مرد کے سینے پر عورت ہی کے نرم ونازک ہاتھ نیکی کے ہتھیار سجاتے ہیں۔'' آج کی عورت نے اس خدمت کو پوری طرح اپنایا ہے۔وہ اپنی نیکی سے مرد کو نیکی سکھاتی ہے،اپنے سماجی اخلاق سے مرد میں سماجی اخلاق پیدا کرتی ہے خود زندگی کی جدوجہد میں آج حصّہ لے کر مرد کو زندگی کی جدوجہد کا سبق دیتی ہے۔اس عورت کی جھلک تم جب ''زیرِ لب'' پڑھو تو خود صفیہ کے کردار میں پاؤ ہوگی۔''

(خاموش آواز)

صفیہ اختر نے اپنی محبت ووفا شعاری،ممتا،ایثار وقربانی اور فرائض منصبی کی خوش اسلوبی سے ادائیگی عملی اقدام سے اپنی نسوانیت کو بلند کیا اور یہ مقام ومرتبہ حاصل کیا۔صفیہ اختر با ذوق پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ان کے خطوط سے ان کی شگفتہ زبان ،شائستہ مزاج،ادبی ذوق،تنقیدی شعور،سخن فہمی اور بذلہ سنجی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ان کا اُردو ادب کے کلاسیکی سرمائے کا مطالعہ عمیق تھا اور ساتھ ہی ان کی اپنے دور کے شعر وادب پر بھی گہری نظر تھی۔ان کے جملوں میں جذبات کی صداقت ،سادگی اور بے ساختگی

کے با وجود ادبی شان موجود ہے۔ انھوں نے جاں نثار اختر کو Inspired کیا جس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہاں تم نے اپنے اس خط میں ''خاموش آواز'' پڑھ کر جس ہمدردانہ لہجہ میں سب کچھ لکھا ہے میں اس کے لیے تمہارا ممنون ہوں۔ میں اس نظم کے بارے میں تمہیں بتاؤں! یہ نظم مجھ سے زیادہ خود صفیہ کی کہی ہوئی ہے وہ کیسے؟ اس کا اندازہ تم صحیح طور ''زیرِ لب'' پڑھ کر کرسکو گی۔ اس کے نہ جانے کتنے جملے اس نظم کے مصرعے بن گئے ہیں۔'' (خاموش آواز)

صفیہ اختر کے خط سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:

''کل ایک خط لکھ چکی ہوں تمہاری خیریت میں دل لگا ہے۔ نظم پڑھی تھی تم نے انجمن میں کیسی رہی؟ غزل جو تم نے لکھی ہے تمہارے زمانے سے کم سے کم دوسو برس پہلے والے شاعر کا رنگِ تغزل ہے۔ یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا سوجھی پھر بھی اس کے بعض اشعار مجھے چھو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ہی کہی ہوئی بات کو تم نے شعر میں دہرادیا ہے۔''

جاں نثار اختر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور اپنی شاعری کے ذریعہ معاشرے کی بہت سی سماجی برائیوں کو ختم کرنے اور ملک کو انگریزی سامراجیت کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے انقلاب لانا چاہتے تھے۔ جاں نثار اختر کہتے ہیں ان کے اندر انقلابیت کا جذبہ صفیہ نے بیدار کیا تھا۔ وہ صفیہ کو Friend Philosopher and Guide مانتے تھے۔ وہ کسی مفکر یا فلسفی کی طرح صفیہ کو Quote کرتے ہیں اور صفیہ کے جملوں کو دہراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آؤ اپنے انفرادی غم کو بھول کر دنیا کے غم کو اپنا لو اس طرح کے تم میں انقلاب پسندی جاگ اٹھے۔ مجھے صفیہ کا جملہ یاد آ گیا ''انقلاب پسندی موت سے رغبت نہیں دلاتی۔ زندگی کا حوصلہ بیدار کرتی ہے۔ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیو، پھر یہ غم تمہارے پاس کبھی نہ بھٹکے گا ساتھی''

''تم یقین کرو میں نے صفیہ سے بہت کچھ جینے کا سلیقہ سیکھا ہے اور صحیح معنوں میں وہ میری رہنما اور رہبر رہی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اگر صفیہ مجھے نہ مل گئی ہوتی تو میرے بھٹک جانے کے امکانات پیدا ہو ہی گئے تھے۔ میرے مرنے کا سلیقہ مرنے جینے کا شعور یا اے مری شمع وفا! اے مری منزل کے چراغ ''یہ مصرعے میں نے ''خاکِ دل'' میں محض رسماً نہیں کہے ہیں۔ اور سچ جانو شانے پہ میرے آج تلک ہے تیرا ہاتھ'' کا احساس میں ایک لمحے کے لیے نہیں بھول سکتا ہوں۔''

ان خطوط میں صفیہ کے ادبی ذوق اور تنقیدی شعور کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ جاں نثار اختر کی نظم ''ستاروں کی صدا'' پر ترقی پسند شعراء واد با خصوصاً کرشن چندر اور مہدی نے اعتراض کیا۔ جاں نثار اختر نے صفیہ کو خط میں اس بارے میں لکھا اور اور صفیہ جس سلجھے ہوئے انداز میں کرشن چندر کو مدلل جواب دینے اور اپنے موضوع کا دفاع کرنے کا مشورہ دیتی ہیں وہ ان کے پختہ تنقیدی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔

''تمہاری نظم پر کرشن چندر اور مہدی کا اعتراض جو تم نے لکھا ہے میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بعض وقت انجمن میں عجیب الٹی سیدھی بحثیں ہوتی ہیں۔ کرشن اور مہدی کا اعتراض تمہاری نظم پر کسی طرح صادق نہیں آتا۔ تم نے اوہام پرستی کو بنیاد ضرور بنایا ہے لیکن

اس کا غلط استعمال نہیں کیا بلکہ اوہام کو یہ توڑتی ہے۔کرشن کو میں بڑا افسانہ نگار مانتی ہوں لیکن اس کی سخن فہمی کی میں قائل نہیں اور اختر تم کرشن سے ضرور پوچھنا کہ ان کے افسانے ''بت جاگ گئے ہیں '' سے توہم پرستی پھیلتی ہے یا نہیں۔''

صفیہ اختر ادب سیاست اور سماج پر گہری نظر رکھتی تھیں ۔ان خطوط میں ترقی پسند تحریک سے نظریاتی وابستگی اور سماجی شعور سے ان کی عصری آگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔شخصی اور انفرادی نوعیت کے حامل ان خطوط میں اجتماعی زندگی بھی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔اس سلسلے میں فراق گورکھپوری لکھتے ہیں۔

'' یہ خطوط ایک انسانی نوشتہ یا دستاویز Human Document جس کی مثال بسا اوقات اچھے اور کامیاب ادب میں بھی ہمیں نہیں ملتی۔ان خطوط کی ادبیت اگر تابناک ہے تو ان کی انسانیت تابناک تر ہے۔ہر خط میں ایک من موہنی شخصیت کا دل دھڑکتا ہوا سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔آپ بیتی اور جگ بیتی کا سنگم ہر خط نظر آتا ہے۔کاش اردو میں ایسی اور کتابیں دستیاب ہوتیں۔''

ان خطوط میں ہمیں لطیف مزاحیہ عناصر بھی ملتے ہیں جن سے صفیہ اختر کی بذلہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے خط لکھتے ہوئے سہیلیوں سے چھیڑ چھاڑ کو نہایت شگفتگی سے بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اس وقت سلمٰی اور سعیدہ کرامن کاتبین بنی ہوئی ہیں ۔میرے دائیں بائیں بیٹھی ہوئی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ لکھتے ہیں اور یہ پڑھ رہی ہیں۔البتہ بیچ بیچ میں طرح طرح کے اشاروں کنایوں سے مجھے اپنی طرف موہ لیتی ہیں اور پھر یہ خط تنہا رہ جاتا ہے۔

جاں نثار اختر کی سگریٹ نوشی کی عادت سے بیزاری کے اظہار کے لیے صفیہ سگریٹ کو تجسیم و تمثیل کے ذریعہ ایسا پیکر عطا کرتی ہیں جیسے وہ ان کی سوتن ہو۔اس خط میں ایک بیوی کی محبت شوہر کی صحت کو لے کر تشویش و فکرمندی اور غلط عادتوں سے چڑ کا اظہار مخصوص مشرقی نسائی لب ولہجہ میں ملاحظہ ہو:

''سگریٹ کو میری رقابت پر مبارک باد کہنا۔بتاؤ کی زندگی کے کن کن لمحوں میں میرے بجائے وہ تمہاری ساتھ بنی رہتی ہے۔اس کمبخت نے ہماری خلوتوں ہی میں کب ساتھ چھوڑا۔''

صفیہ اختر عورت مشرقی روایتی عورت اور تعلیم یافتہ روشن خیال اور اپنے حقوق و فرائض سے آشنا نئی عورت کا ایک حسین امتزاج ہیں۔وہ اپنی تمام تر ترقی پسندی،خودمختاری،معاشی طور پر خود کفیل اور ملازمت پیشہ ہونے کے باوجود عورت کے روایتی کردار کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتی ہیں۔عورت مختلف حیثیتوں اور رشتوں کے ذریعہ مرد کی زندگی کو خوشحال اور کامیاب بناتی ہے۔وہ شوہر کی خدمت اور بچوں کی نگہداشت کو عورت کے لیے سب سے اہم تصور کرتی ہیں۔موجودہ معاشرے میں اس سوچ کے بدل جانے کے نتیجے میں گھروں کا ٹوٹنا اور رشتوں کا بھکراؤ عام باتیں ہوگئی ہیں ۔صفیہ اختر کے یہ خیالات شوہر کے لیے دوست کا تصور رشتہ ازدواج کو زیادہ پُر اعتماد اور خوبصورت بناتا ہے۔وہ وفا شعاری اور خود سپردگی کو عورت کی عظمت قرار دیتی ہیں۔

''شوہر کا تصور میرے لیے ایک دیوتا کا تصور نہیں ایک دوست کا تصور ہے۔لیکن ایک ایسے دوست کا تصور جو مجھ سے بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتا ہو،خیالات میں،ارادوں میں،عمل میں اور پھر اس فوقیت کو تسلیم کرنے میں مجھے ایک ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔شاید جذبۂ تعظیم ہی عورت کی فطری کمزوری ہے جس سے مرد ہمیشہ فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔اپنی ذہنی پختگی کے باوجود مجھے اپنی نسائی کمزوری حسین نظر آتی ہے۔''

دوستی کا رشتہ ایک ایسا عظیم رشتہ ہے جس میں ہم

دوست کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں ۔ ہر چھوٹی بڑی بات دوست کے ساتھ بلا جھجک بانٹتے ہیں ۔کسی بھی رشتے میں دوستی کا عنصر اسے بے تکلف اور پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے۔صفیہ جاں نثار اختر کو اسی بات کا تیقن دلاتے ہوئے کہتی ہیں۔

''بجنور جاؤ گے یا نہیں ؟ میری صلاح کی ضرورت محسوس کرو تو تکلف نہ کرنا ،دوستی کا رشتہ ہمیشہ مضبوط ہونا چاہیے ۔یہی میری خواہش ہے۔''

صفیہ اختر ایک آئیڈیل مشرقی عورت ہیں وہ شوہر اور بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں اور کبھی کبھی اپنی ضرورتوں کو ان کی ضرورتوں اور خواہشات پر ترجیح دیتی ہیں یہ امر ان کے لیے تسکین وراحت کا سبب بن جاتا ہے۔ایک شوہر کی زبانی اس طرح کا اعتراف مشرقی عورت کے لیے خراج تحسین معلوم ہوتا ہے۔ خاموش آواز میں جان نثار اختر واجدہ تبسم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''صفیہ کی زندگی میں تو اپنی کسی چیز کے بارے میں میں نے سوچا ہی نہیں۔تم یقین جانو اپنی اس زندگی میں جو میں نے صفیہ کے ساتھ گزری کبھی گلے کے بٹن تک میں نے اپنے لیے نہیں خریدے۔بس میری پوری دیکھ بھال اس کے سپرد تھی اور یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ صفیہ میری اس دیکھ بھال میں صحیح معنوں میں pleasure محسوس کرتی تھی''

صفیہ اختر کے یہ خطوط ہندوستانی عورت میں محبت ،حجاب ،وفا شعاری ،خود سپردگی اور ایثار و قربانی کی نہایت خوبصورت شبیہ پیش کرتی ہیں ۔ان خطوط میں جدائی کا کرب بھی ہے اور ملنے کا مشتاقانہ اظہار بھی ہے۔ایک طرف جان لیوا بیماری ،معاشی پریشانیاں ،نا مساعد حالات اور دوسری طرف صفیہ اختر کا عزم واستقلال۔وہ زندگی مستعار کے ہر پل کو بھرپور جینے کی للک کے ساتھ بیتے دنوں کی خوشگوار یادوں کو اپنے آنچل میں سمیٹے مستقبل کو پُر امید نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔یہ تمام صفات مشرقی عورت کی نسوانیت کو بلندی اور وقار عطا کرتی ہیں۔

☆☆☆

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200روپے

-/800طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

جاں نثار معین

مضمون

'ایوانِ غزل' میں حقوقِ نسواں

تلخیص

اردو فکشن میں عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم وغیرہ نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ جدید مسائل نسواں سے آگہی کی ہیں۔ جیلانی بانو نے اس روایت کو پختگی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ اسی لیے عصر حاضر کی منفرد فکشن نگارات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں مرکزی خیال صنفی تصورات ہے۔ عائلی مسائل، صنفی مساوات، پدر سری نظام، تشدد، بے جوڑ شادیاں، کم عمر کی شادیاں، مسائل نسواں، تعلیم نسواں، جہیز، زنا بالجبر، داشتاوں کے مسائل اور متعدد طبقہ نسواں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو مرکزی خیال بنایا۔ مذکورہ تمام مسائل میں حیدرآباد کی خواتین نظر آتی ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ حالاں کہ جیلانی بانو سے قبل ترقی یافتہ اور تانیثی مفکرین نے تو مرد و زن کو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ دونوں صنفوں کی صلاحیتوں کو دماغی ساخت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے نہ صرف الگ سمجھا ہے بلکہ ایک دوسرے سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیلانی بانو نے اپنے ناول "ایوان غزل" میں مرد ماتحت معاشرہ میں حقوق نسواں کی حمایت کی ہے اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ویسے تو اس ناول کا مرکزی خیال ہی حیدرآباد کی مسلم خواتین کے مسائل پر مبنی ہے۔ جس کا ثبوت ناول کا پہلا نام "عہد ستم" تھا۔ حالات کی وجہ سے بدل کر ایوان غزل رکھا دیا۔ ناول میں مسائل نسواں کی پش کش اور ان کی مزمت کی گئی ہے۔ زیر نظر ناول "ایوان غزل" تلنگانہ تحریک پر مبنی ہے۔ اسی لیے مضمون بیانیہ انداز میں تاریخی طریقہ کار رکھا ہے۔ مقالہ کے مقاصد بھی ناول میں مسائل نسواں کی نشاندہی کرنا ہے۔ جیلانی بانوں نے کیوں مسلم معاشرہ کی خواتین کو مرکزی خیال رکھا ہے؟ کیا یہ ناول پسند ماندہ خواتین کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے؟ کیا جیلانی بانو نے طبقہ نسواں کے لیے مساوات کا پیغام دیا ہے؟ ان سوالات کی روشنی میں مضمون مکمل کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کے ذریعہ طبقہ نسواں میں آگہی پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: حقوق نسواں، جاگیرانہ نظام، صنفی استحصال، پدر سیری نظام۔

☆☆☆

1 تعارف

جیلانی بانو ایک ترقی پسند ادیبا ہیں۔ ان کی تحریروں میں تانیثی فکر نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسندوں کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ اس وقت عوام میں طبقاتی نظام کے خلاف جذبات اور بغاوت ابھر کر ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بالخصوص تلنگانہ کی مسلم خواتین میں ان کی تخلیقات نے جان ڈال دی تو دوسری طرف جاگیردارنہ نظام کے تشدد کی مزمت کی۔ حیدرآباد کے نظام نے حقوق نسواں چھین لیے تھے۔ یہاں تک کہ تہذیبی و ثقافتی روایات بھی منتشر تھیں۔ اسی زمانے میں تقسیم وطن کا المناک واقعہ پیش آیا۔ فسادات میں معصوم مارے گئے۔ ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ جس کے انجام میں ایک نئی تہذیب وجود میں آرہی تھی۔ عوام بیدار ہو رہی تھی۔ کسان اور مزدور اپنے پیروں پر کھڑے ہو رہے تھے۔

آزادی سے قبل ہندوستان میں موجود جاگیردارانہ نظام کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سے قبل ہی یہ طبقہ زوال پذیر ہو چکا تھا۔ دم توڑتے جاگیردارانہ نظام میں خواتین کی زندگی جن حالات کا شکار تھی ناول کے مرکزی کردار غزل اور دوسرے اہم کردار چاند کے حوالے سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں نیلم

فرزانہ کا خیال ہے۔اس مخصوص نظام میں عورت بے زبان مخلوق تھی ۔کبھی وہ بی بی بن کر معذور کر دی جاتی ہے۔کبھی چاند اور غزل کو چمکتے سکّوں کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ان کی زندگی تلوار کی دھار سے ہو کر گزرتی ہے۔جہاں ان کا جسم ہی نہیں روح بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتی ہے۔ایوانِ غزل کے تمام نسوانی کردار اس مخصوص نظام میں عورت کے مسلسل استحصال کے نمائندے ہیں۔[۱] وہ اس استحصالی طبقے کی آمریت اور پس ماندہ طبقوں کی مظلومیت کی تصویر یں اتارتی ہیں۔

ناول میں طبقہ نسواں پر ہو رہے صدیوں سے چلے آ رہے ستم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔خود عورت ہونے کے ناطے محکومی زمانے میں اور حصول آزادی کے بعد خواتین کے جذبات کو پیش کرتی ہیں۔خواتین کی خستہ حالی کے ساتھ بدلتے حالات میں ان کی بیداری کو بھی اجاگر کیا۔ان کی نظر میں لڑکیاں اور خواتین اپنے فطری حقوق سے محروم کی گئی ہیں۔لیکن وہ زندگی کی جدو جہد میں برابر کا حصہ لیتی ہیں۔وہ ہر انقلابی تحریکوں میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔وہ خود عورت کو اپنے وجود کو پہنچاننے کی دعوت دیتی ہیں۔وہ عورت کا ایک مثالی کردار بھی ادا کرتی ہیں۔جس کا ثبوت ناول کا ایک حصہ جس میں تخیل میں بسی ایک مثالی لڑکی کچھ اس طرح ہے۔"شاید اسی لیے میرے دل میں اس لڑکی کے لیے بڑی عقیدت تھی، جو پہاڑوں کی کھوہ میں چھپی اپنے حقوق کی لڑائی جیت رہی تھی۔میرے آس پاس جب کوئی باپ بیٹی کو جہیز دینے پر خودکشی کر لیتا۔جب کوئی ماں بیٹی کی پیدائش پر آنسوؤں کی دھار نہ روک سکتی۔جب کوئی شوہر تین بار زبان ہلا کر بیوی پر موت و زندگی حرام کر دیتا ہے۔تو وہ لڑکی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔وہ جوان با ہمت کنواری لڑکی جو رسموں ، روایتوں ، سماج اور مذہب کے سپاہیوں سے بیک وقت لڑ رہی تھی۔وہ آئیڈل لڑکی میرے خیالوں میں بس گئی تھی۔میں نہ جانے کتنے بار عزم اور جرات مانگنے اس کے سامنے گئی ہوں۔ہر بار اس نے میرے سامنے ایک نیا چراغ جلایا ہے۔[۲] آزادی سے قبل جاگیردارانہ نظام میں عورت کی حیثیت ایک غلام کی سی تھی۔ بیوی کو خاموش تماشائی بننا پڑتا تھا۔ بہن کو بھی پابندیوں اور مجبوریوں کے ساتھ گزارنا پڑتا تھا۔ بیٹی یا بھانجی ہے تو اسے اپنے معاملات میں فائدے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔اس کی عزت اور اس کے جذبات مجروح ہو جاتے تھے۔ناول کی ہیروئن غزل بھی باپ کے تحکمانہ انداز کے سبب کبھی پر سکون زندگی نہیں گزار سکی۔بچپن، جوانی، شادی ہر وقت ایک ذہنی دباؤ اور شدید اذیت سے دوچار رہی۔

جاگیردارانہ نظام زوال کی زد میں آ رہا تھا۔کسان اپنے حقوق کے مطالبات کر رہے تھے۔اس کے اثرات جیلانی بانو پر گہرے مرتب ہوئے۔ وہ بدلتے ہوئے حالات ،تمام خارج واقعات کا انسانی نقطہ نظر سے مشاہدہ کر رہی تھیں۔انسانوں کی زبوں حالی اور پس ماندگی کو دیکھ کر بہت فکر مند ہو جاتی تھیں۔اسی سے ان کے تخلیقی ذہن کی پرورش پرداخت ہوئی۔انہی مشاہدات اور احساسات کا اظہار اپنی تحریروں میں کیا۔جس سب سے قابل ذکر پہلا ناول 'ایوان غزل' (1976) ہے۔اس کا پہلے نام " عہد ستم " رکھا تھا۔لیکن ایمرجنسی کی وجہ سے اس طرح کی کتابوں پر سنسر شب عائد تھی۔اسی لیے نام بدل کر ایوان غزل لکھا۔جو آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد چند سالوں تک حیدرآبادی تہذیب کا معروضی مطالعہ ہے۔'ایوانِ غزل' ایک ایسی تہذیب کے زوال کو موزائیک کے ٹکروں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔جس کے بغیر معاشرتی و سیاسی تاریخ نامکمل ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا خیال ہے:

تہذیب کی شکستگی اور زوال ہمارے ناول نگاروں کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اس سلسلے میں عزیز احمد کا نام نمایاں ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ڈاکٹر احسن فاروقی اور چند دیگر ناول نگار بھی اسی موضوع کے ٹریٹ منٹ (Treatment) میں قابل ذکر مقام رکھتے ہیں۔عزیز احمد کا ناول " ایسی بلندی ایسی پستی"

حیدرآباد دکن کی تہذیبی زوال آمادگی کا کامیاب نوحہ ہے۔لیکن اپنے کینوس میں یہ "ایوان غزل" کے مقابلے میں مختصر نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں محض جنس پرستی، سماجی ریاکاری، بے سمت زندگی اور گھریلو رشتوں میں شکست و ریخت اور ان تمام منفی اعمال کے نتیجے میں زندگی ابھرنے والے روحانی خلاء ہی کو ایک مشترک تھیم کی حیثیت سے برتا گیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول " شام اودھ" کی موضوعاتی اہمیت محض اودھ کے تہذیبی زوال ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے نزدیک وضع داری کے خاتمے اور نئی اقدار کا طلوع ہونا ایک المیہ سے کم نہیں۔ گو کہ وہ نواب ذوالفقار علی خان کی وضعدار کے بطن میں پنپا کور چشمی ، رجعت پسندی اور روشن خیالی کی عدم موجودگی کے احساس کے پس منظر کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔" شام اودھ" کا کینوس بھی تہذیبی حوالوں سے "ایوان غزل" سے اچھوتا ہے۔[۳]

ناول کے مرکزی نسوانی کردار

'غزل' ایک سیدھی سادی ، جذباتی اور معصوم لڑکی ہے۔ حالات کے نشیب و فراز کو دیکھنے کے باوجود اس کے اندر دانش مندانہ ہنرمندی اور چالاکی پیدا نہیں ہوتی۔ نصیر اسے محبت کا سبز باغ دکھا کر بے وفائی کر جاتا ہے۔ لیکن حرف شکایت لب پر نہیں لاتی۔ بلکہ اس کی دی ہوئی انگشتری کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ پھر شاہین سے شادی ہونے کے بعد اس کو ماں بننے کی ازلی خواہش ہوتی ہے۔ یہ خواہش پوری نہیں ہو پاتی۔ جس سے اس کی ذہنی الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں۔ پھر دونوں کے درمیان ایک کھائی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی سابقہ محبت کی دنیا میں واپس آتی ہیں اور نصیر کے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ مگر ایک عرصہ بعد جب نصیر اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہندوستان واپس لوٹتا ہے اور جب اس کی ملاقات غزل سے ہوتی ہے تو نصیر اس کی انگلی سے دو انگشتری اتار لیتا ہے جو اس نے غزل کو بطور نشانی دیا تھا۔ نصیر کی اسی حرکت پر غزل کے جذبات چھلک پڑتے ہیں اور وہ برداشت کر پاتی اور آخر کار اس صدمے سے دوچار ہو کر موت کی آغوش میں پہنچ جاتی ہے۔ غزل معصوم قسم کی لڑکی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ جو حالات کے نشیب و فراز سے بے خبر رہتی ہے۔ وہ جذباتی طور پر اتنی کمزور اور محبت کی بھوکی ہے کہ ادھر کوئی اسے محبت کا سبز باغ دکھلاتا نہیں ہے کہ وہ اپنا سب کچھ انچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن جب اسے محبت نہیں ملتی ہے تو اس کے اندر عدم تحفظ کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔

'چاند' کی حالت بھی غزل سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ غزل جن حالات سے نبرد آزما ہوتی ہے ان حالات کو پیدا کرنے میں اس کا باپ ہمایوں ذمہ دار ہے۔ لیکن چاند کو اس کے ماموں راشد نے دانشمندی اور چالاکی سے اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس سے ہر ممکن فائدہ اٹھاتا ہے۔ بھارت کلا مندر کا بد اخلاق سکریٹری چاند پر مہربان ہوا تو راشد اپنے بزنس اور فائدے کے لیے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جب چاند، سنجیوا کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے تو غزل کو چھوڑ کر سارا گھر چاند سے متنفر رہنے لگتا ہے۔ چاند ایک ضدی لڑکی تھی ۔ وہ سنجیوا کے ساتھ خودسری سے کام لیتی ہے اور سنجیوا چاند کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کا نصب العین چاند کی محبت سے زیادہ اہم ہے۔ اس طرح چاند اس کی محبت نہ پا کر تب دق کا شکار ہو جاتی ہے۔ آخر کار اس کا انجام بھی موت پر واقع ہوتا ہے۔ چاند کا کردار بھی اسی طرح کے حالات سے نبرد آزما ہوتا رہتا ہے۔ البتہ قیصر اور کرانتی کے کردار میں زندگی کی بھرپور توانائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اپنی سماجی زندگی کے حالات کے مطابق یہ کردار ڈھلتے ہیں اور کبھی حالات کی چوکھٹ میں فٹ نہ ہونے کی صورت میں باغیانہ روپ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

'قیصر' کا کردار غزل اور چاند دونوں سے منفرد ہے ایک باغی لڑکی کا ہے۔ قیصر غزل اور چاند کی طرح گھٹ گھٹ کر سرد آہ لینے اور شکست کی صورت میں دم توڑنے کی حامی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے باغیانہ عمل اور ردعمل کے ذریعہ اس نظام زندگی سے انتقام لینا

چاہتی ہے۔ قیصر اور زندہ نسل کی روشنی بن کر معاشرے کی رہنمائی کرنے کا عزم اور ارادہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تلنگانہ تحریک کے مجاہدوں کے ساتھ مل کر فرسودہ نظام کو اکھاڑ پھینکتی ہے اور ایک نئے نظام کی تعمیر کے لیے اپنے مشن میں لگ جاتی ہے۔ اس طرح قیصر کا کردار زندگی کی توانائی اور حرکت وعمل سے لبریز ہوتا ہے۔

'کرانتی' کا کردار بھی حرکت وعمل سے نہ صرف پر ہے بلکہ اس کے اندر توانائی اور پوری قوت موجود ہوتی ہے۔ وہ اندھیرا کی نئی نسل کے نئے انقلابی عزائم کا غماز ہے۔ کرانتی روایات کا مین بن کر اور راشد کی طرح مصیبت بھری زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی۔ وہ حق گوئی اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے لیے عوامی طاقتور اور انقلابی دستور کے ساتھ اپنا رشتہ منسلک کر لیتی ہے۔ وہ اپنا حق چھیننے اور ظالموں کے خلاف جہاد کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ کرانتی کے خیالات اور اس انقلابی رویے کا اندازہ اس منظر سے کیا جا سکتا ہے۔ "میں لڑنے جا رہی ہوں.....آج آپ نے نیوز پڑھی آنٹی؟ ورنگل میں سات آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ کیا آدمی کا خون اتنا سستا ہے۔ آنٹی؟ وہ کمرے میں ادھر اُدھر گھوم کر کچھ چیزیں اپنی جیبوں میں بھر رہی تھی کیا اپنے لیے حق راحت اور انصاف مانگنے کی سزا ختم نہ ہوگی۔؟ کرانتی ایک ایسی چنگاری کی طرح ابھرتی ہے جو رشتوں کا مطلب بھی جانتی ہے اور کبھی کبھی رشتوں کو توڑنا بھی جانتی ہے۔ سیاسی، سماجی اور جنسی موضوعات پر کھل کر بحث بھی کر سکتی ہے اور اپنی حفاظت اور حقوق کے لیے جدو جہد بھی کرنا جانتی ہے۔

ناول 'ایوان غزل' کا آغاز واحد حسین سے ہوتا ہے۔ وہ قدیم خیالات کے مالک ہیں۔ اپنے بھائی احمد حسین کی جائیداد پر قبضہ چاہتا ہے۔ لیکن تقدیر ان کے عقب میں چلتی ہے۔ ان کے بھائی احمد حسین کے یہاں لونڈی سے نصیر حسین پیدا ہوتے ہیں۔ وہ عیال دار شخص۔ ہیں اور ان کے بیٹوں اور بیٹیوں سے جو اولادیں ہوتی ہیں۔ وہی ناول کا مرکزی حصہ ہے۔ وہی قدیم کو جدید سے ممیز کرتی ہیں۔ ان کی زندگیوں کے سفر میں فرسودہ گھناونی گھریلو روایات و رسوم، وہم و توہمات، مشترکہ کلچر کے مسائل، سوچ کی بوسیدگی، استحصال زدہ خواتین کی ذہنی گھٹن اور دائرے سے نکل جانے کی خواہش اور نئی نسل کے انقلابی خیالات اور اس کے افکار و اعمال سے پیدا شدہ اچھے برے نتائج کی دھمک ہمیں ان کے ذریعہ ہی سنائی دیتی ہے۔

ناول کے کینوس کو وسیع تر بنانے میں اشترا و انقلابی ذہن رکھنے والے کردار سنجیو، قیصر اور واحد حسین کے داماد حیدر علی خاں ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں تو تلنگانہ تحریک کا عمل دخل نظر آئے گا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کی وجوہات، تحریک آزادی اور انگریز دشمنی کے ناقابل فراموش واقعات نظر آئیں گے۔ جیسے جلیا نوالہ باغ میں ہوئے قتل و غارت گری کے واقیات، نظام کی فوج پر انقلابیوں کے حملے، ہندو مسلم فسادات اور انتشار سے مملو واقعات نظر آئیں گے۔ سیاست دانوں کا الحاق پر اصرار اور اتحاد بین المسلمین کی عملی کارروائیوں اور سقوطِ حیدرآباد دکن کا فسانہ پڑھنے کو ملے گا۔ ساتھ ہی نظام سرکار کی بے عملی اور بے بسی و نتیجے کے طور پر صدیوں کے جمے جمائے معاشرے کی بربادی اور انہدام کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ جیسے دوسرے واقعات کو جیلانی بانو نے محض بیانات کے سہارے نہیں بلکہ ایکشن کے توسط سے آشکار کیا ہے۔ جس کا ثبوت ناول کا ایک منظر کچھ اس طرح ہے۔ ''چیچک کی وبا پھیلتی تو مسلمان خواتین دیوی پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں اور درگاہوں کے عرس میں ہندوؤں کی جانب سے نذروں کے خوان آتے۔ بی بی کے علم پر مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی جانب سے شربت کی سہیلی لگتی چاندی کے چاند اور پنجے چڑھائے جاتے۔ رمضان میں ہندوؤں کے یہاں سے مسجدوں میں افطار بھیجی جاتی تھی۔ ریاست میں ہر مسلمان تلگو جانتا تھا۔ تمام ہندو لڑکے اردو میڈیم پڑھتے تھے مگر انہیں کبھی مادری زبان کی جانب سے خطرہ نظر نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ ابھی ان کے دلوں میں نفرت کی ایسی آگ

نہیں بھڑکی تھی جوخلوص کے ہر پھول کوجلا ڈالتی۔'' ۵؎

جیلانی بانو نے حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کی بہترین عکاسی کی ہے۔ جیسے واحد حسین کی وضعداری، نئے حالات میں بے توقیری، بھائی کی جائیداہتھیا نہ پانے پراحساس محرومی اوراپنی نواسیوں چاند اورغزل کواپنے طریقوں پر نہ چلاپانے پرشدید غصہ اوراداسی اپنے ترقی پسند داماد حیدرعلی خان کی ایک دہشت پرستانہ تحریک سے وابستہ عورت سے دوسری شادی اور دوسرے داماد ہمایوں شاہ کے لالچ اوراس کی گھناونی زندگی پر دانت پیش کررہ جانے کےحقیقت پسندانہ عمل ہے۔

واحد حسین جو کہ دیگر کرداروں کے ظہور کامنبع ومخرج ہیں۔اپنے جلو میں دوزبردست کردار ہیں۔ یہ دونسوانی کرداران کی نواسیاں چاندارغزل ہیں۔ چاندترقی پسندانقلابی کردارحیدرعلی خان کی بیٹی ہے۔غزل ہمایوں شاہ سے ان کی دوسری نواسی ہے۔ چانداورغزل روشن خیال اور پڑھی لکھی ہیں۔ وہ فنکارہ ہیں اورسو سائٹی کی جان ہیں۔لیکن دونوں کا انجام دردناک ہے۔ چاند پرکئی مردفریفتہ ہوتے ہیں۔فرسٹریشن وآرزوں کی پامالی اس کا مقدر ہے۔اسے ٹی بی ہوجاتی ہےاوراسی میں دم توڑ دیتی ہے۔غزل کو چچازادنصیرحسین دھوکہ دیتا ہے۔وہ پاکستان میں شادی کرکے جب بچوں سمیت حیدرآباد پہنچادیتا ہے۔جس کی وجہ سےغزل موت کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ یہ سب دل پراثر کرنے والے واقعات آزادی کے بعداپنا اثبات کراچکے تھےاورہندوستانی رشتہ دارلڑکیوں سےخاصی بےوفائی اوراغماض کاسلوک رکھا تھا۔

ناول کا مرکزی خیال حیدرآباد کی سیاسی و سماجی تبدیلیاں اور جاگیردارانہ معاشرت میں گھٹن، بےبسی اوراستحصال کی شکارخواتین کی داستان ہے۔ایک طرف محلوں میں زمینداروں اورجاگیرداروں کی خواتین گھٹن اور بےبسی کی زندگی گزارتی ہیں۔ اور ماتحت افرادکی خواتین ان کی جنسی ہوس کانشانہ بنتی ہیں۔مصنفہ نے ایسے مسائل کوپیش کیا ہے۔ناول نگار نے جاگیردارنہ نظام کی زیادتیوں کی عکاسی بھی بخوبی کی ہے۔٦؎اس کااعتراف خودمصنفہ کرتی ہیں:

اس ناول کو میں نے ایک شدید کرب جیسی کیفیت سے شروع کیا تھا۔ کیوں کہ اس کا موضوع میرے ذہن پرایک بوجھ بنارکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اس بکھرتے ٹوٹتے ہوئے حیدرآباد کا سارادردکسی طرح اپنی تحریر میں سمیٹ لوں تاکہ یہ ایک خواب کی طرح دماغ سےمحونہ ہوجائے۔اس کے ساتھ ہی یں یہ بھی چاہتی تھی کہ ایک مخصوص تہذیب کے زوال پذیر ہونے کے جومحرکات کومحسوس کر سکوں۔ اس کے لیے مجھے ان بدلتے ہوئے حالات کےعوامل تلاش کرتے تھے۔ اس اخلاقی اور معاشی زوال کے اسباب بھی دیکھنے تھے جوحیدرآباد کی سماجی زندگی میں شروع ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے ناول میں ماضی کوپیش کرناپڑا تاکہ میں ماضی کے سہارے حال اورمستقبل کےامکانات کوموضوع بناسکوں۔

جیلانی نے حیدرآبادی کی سرمایہ دارانہ نظام کے زوال کی کہانی قلم بندکیا ہے۔ وہ اس نظام کےتحت ہونے والےظلم وستم کےخلاف صدائے احتجاج بلندکیا ہے۔درمیانہ طبقہ کی خواتین کے بچپن، دوشیزگی، شباب کو پیش کیا ہے۔ ناول میں محمد حسین اپنی اہلیہ بی بی، لنگڑی بہن گوہراور بیٹے راشد، اس کی بیوی رضیہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ان کی دونوں بہنیں بشیربیگم اور بتول بیگم مختلف رنگ ڈھنگ کے گھرانوں میں بیاہی جاتی ہیں۔ ایک پرانے خیالات کی ہے دوسری ماڈرن۔ بشیربیگم کےشوہرحیدرعلی خاں ترقی پسند ہیں۔بتول بیگم کےسسرال والے ہیں۔حیدرعلی خاں کی بیٹی چاندکی تربیت ایسے ہی آزادانہ ماحول میں ہوتی ہے۔ بتول بیگم کی بیٹی غزل ہی ناول کی ہیروئن ہے۔بتول کی سسرال الف لیلیٰ ہےاس کے سسرالحاج مسکین علی شاہ طوطا چشمی ایک درگاہ کے مجاور ہیں۔ وہ بے پنا دولت حاصل کرتے ہیں۔ ان دو خاندانوں کی کرداروں کے بدولت کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اور دومرکزی کرداروں میں غزل اور چاندسامنے آتے ہیں۔ان کی زندگی کے

مختلف پہلوؤں اوران کی ذہنی جذباتی کیفیات کی مصوری اس ناول میں ہے۔ بشیرا بیگم کی موت کے بعد حیدر علی خان ایک کمونیسٹ ورکر "چاند" سے شادی کر لیتا ہے۔ جو آزاد خیال ہے۔ اور ماں کی موت کے بعد بیٹی غزل اپنے باپ ہمایوں علی شاہ کے ظلم و ستم کی شکار ہو جاتی ہے۔ بعد میں باپ کے رویے میں تبدیلی آجاتی ہے۔

غزل والدہ کے گزرنے کے بعد مستقل ایوانِ غزل میں بس جاتی ہے۔''ایوان غزل'' میں ادبی تقریبات ہوا کرتی تھیں۔جشن قوالی کبھی غزلوں کی شامیں کبھی رقص کی محفلیں وغیرہ۔ واحد حسین موسیقی و رقص کے دلدادہ تھے۔ واحد حسین کے بیٹے ارشد حسین اوران کی بیوی رضیہ کوایک لڑکی تولد ہوتی ہے اس کا نام غزل رکھا جاتا ہے۔وہاں پر وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ کئی افراد سے عشق و عاشقی کرتی ہے۔لیکن شادی شاہین سے کر لیتی ہے۔ پھر زندگی سے تنگ آکر خودکشی کر لیتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاؤں میں دیش مکھ اور جاگیرداروں نے لوٹ کھسوٹ کو اپنا حق بنا لیا تھا۔ کسان کی عزت بچی تھی اور نہ دولت وہ دن دھاڑے کھیتوں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاشرہ خواتین کے لیے اتنا سخت ہو گیا تھا کہ عورت کو صرف جنسی عیاشی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ عورت کو اپنی فہم وفراست کبھی بھی خود سے بہتر نہیں سمجھتے تھے۔"خوب صورت عورتاں تو اللہ میاں ہمارے بہلانے کو بنائے ہیں مگر حضرت اللہ میاں نے عورت کو زبان اور ذہن دے کر اس کا آدھا حسن کھو دیا ہے"۔ے خصوصاً مزدروں اور کسانوں کا طبقہ پوری طرح پارٹی کے ساتھ تھا۔۸ مصنفہ نے حیدرآباد کی سماجی وثقافتی اور طبقاتی زندگی کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔اس میں دو الگ الگ خاندانوں کو "ایوان غزل" اور لف لیلیٰ سے جوڑا ہے۔

بچپن میں غزل کی ملاقات سور سے ہوتی ہے اور جوانی میں بھی ملتے ہیں۔غزل سٹیج کی اداکارہ بن جاتی ہے سوراس کی خوبصورتی پر روتا ہے۔لیکن بعد میں بے وافائی کرتا ہے جس کا صدمہ غزل برداشت نہیں کرسکتی اور موت کو گلے لگاتی ہے۔ چاند کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آتا ہے۔ وہ سنجیوا سے ملتی ہے اور عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔لیکن سنجیوا محبت کے بجائے اپنے اشترا کی مقصد کو عزیز رکھتا ہے۔ چاند بھی اسی غم میں مر جاتی ہے۔کرداروں کے آپسی رشتوں کے ساتھ ساتھ ناول میں تلنگانہ تحریک سے حیدرآباد کے الحاق کا مسئلہ اس کے پلاٹ کا حصہ ہیں۔ناول میں ب لاولد والدین کے مسائل ہیں۔اجالا بیگم اپنی باندی سے جو کسی اور سے مل کر ماں بننے والی ہوتی ہے۔ دولت بچانے کے لیے احمد حسین سے شادی کرادیتی ہیں۔اس سے ہونے والے بیٹے کو اپنا وارث بناتی ہیں۔ اس خبر سے محمد حسین کے گھر والے حیران ہو جاتے ہیں۔کیوں کہ سب کی نظر اسی جائیداد پر ہوتی ہے۔''ایوان غزل'' کی کائنات سے باہر کم دکھائی دیتا ہے۔موصوفہ نینا ول کو چاند اور غزل جیسے دوم لازوال کردار فراہم کردی ہیں۔ راشد ماموں اور رضیہ مامی چاند کی خوب صورتی کو اپنے فائدے کی خاطر استعمال کرتے ہی۔ راشد ماموکا کردار یہاں ڈپلومیٹک ہے وہ خاموشی سے استحصال دیکھتا ہے۔

ناول کے تمام کردار جاگیردانہ نظام سے منسلک ہیں۔ جو ماضی کی مٹتی ہوئی قدروں کی آخری نشانی ہیں۔ان کی نمائندگی واحد حسین اور حمد حسین کے ذریعہ کی گئی ہے۔ جو بدلتے حالات سے بے خبر،حسن پرستی،عیاشی،شعروشاعری اور ظاہرداری کو پیش کرتے ہیں۔اس ضمن میں مصنفہ کا خیال ہے"ایسے میں موج اڑانا صرف واحد حسین کے باپ دادا کی میراث تھی۔اس لیے انھوں نے ایوان غزل بنایا اور اس میں ہر زمانے کے مطابق ایک نیا معشوق جلوہ گر رہا۔ان حسیناؤں کا محض تصّور ہی بڑے بڑے جاگیرداروں کو بے چین کئے دیتا تھا۔۹ یہاں تک کہ مرد اپنی حوس کا نشانہ غزل جیسی معصوم لڑکیوں کا کرتے ہیں۔ مرد جنسی استحصال کرنے کے باوجود ان پر بہتان باندھتے ہیں۔انہیں گالیاں بھی دیتے ہیں۔

یہاں تک کہ گناہ اور برائی کا باعث بھی سمجھتے ہیں۔ جب مرد جنسی ہیجان سے نجات پاتا ہے تو پچھتاتا ہے۔ فاحشہ تو مجبوری میں اپنا جسم بیچتی ہے۔ لیکن مرد اپنی شہوت کے باعث کرتے ہیں۔ پدرانہ معاشرہ طوائفوں اور فاحشوں کے درمیان سکون محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بدنام صرف خواتین ہی ہوتی ہیں۔

جیلانی بانو نے مردوں کی جنسی خواہشات کا وہ کس طرح معصوم لڑکیوں کا استحصال کرتے ہیں اس کی عکاسی کی ہے۔ جو کئی خواتین سے جسمانی و رومانوی تعلقات رکھتے ہیں۔ مرد چاہتے ہیں کہ وہ ہ عیاشی کا ذریعہ بنی رہے۔ کبھی وہ " بی بی" بن کر خاموشی سے شکر بنی رہتی ہے، کبھی لنگڑی پھوپھو کی طرح معذور کر دی جاتی ہے۔ کبھی بتول بیگم کی طرح شوہر سے پٹتی رہتی ہے۔ ان حالات سے تنگ آ کر وہ مر جاتی ہیں۔ جس کی بہترین مثال چاند اور غزل ہے جو مسلسل ہوس کی شکار ہوتی رہتی ہیں۔ اور جوانی ڈھلتے ہی نظر پھیر لی جاتی ہے۔ یا تو قیصر جیسی لڑکیوں کو بغاوت کے جرم میں پھانسی دی جاتی ہے۔ اس طرح طبقہ نسواں مردوں کی شکار ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود مرد باعزت اور مظلومہ بے عزت ہوتی رہتی ہیں۔ اس ضمن میں مصنفہ کا خیال ہے:

اس وقت قاعدہ تھا کہ سب ہی نواب دل بہلانے خوب صورت لڑکیوں کو محل میں شامل کر لیتے تھے۔ یہ لڑکیاں غریب ماں باپ کے یہاں فاقے کرتیں یا کسی نکمے جاہل آدمی سے بیاہی جاتی تھیں۔ لیکن محلوں میں انھیں شاندار گھر ملتے، ان کے نام پر جاگیریں اور منصب ہو جاتے۔ ان کی اولاد کا مستقبل درخشاں ہو جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ الگ بخشش سے اپنی قسمت سنوار لیتے تھے۔ مگر پھر بھی دنیا بھر میں روتے پھرتے کہ ان کی لڑکیوں کو زبردستی نواب لوگ اٹھا لیتے ہیں۔[۱۰]

نوابوں کی عیاشیوں کی شکار خواتین کے مسائل اور والدین کی مظلومیت کو پیش کیا ہے۔ چوں کہ غریب والدین اپنی لڑکیوں کو دولت اور مجبوریوں میں سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ لیکن اس گھٹن سے وہ دل دل مرتے رہتے ہیں۔ ناول میں دو غلے والدین اور خوبصورت لڑکیوں کے جنسی استحصال کرتے ہیں۔ "خوش شکل لڑکیوں کی بدولت اس وقت بہت والدین اپنی کئی کئی نسلوں کی قسمت منور کر چکے تھے۔ وہ لڑکی چند مہینے حصور پُر نور کی توجہ خاص کی مستحق رہتی اور پھر غیری باغ کے ایک تاریخ کمرے میں یوں گم ہو جاتی ہے کہ اسے سب بھول جاتے۔ سوائے اسٹیٹ کے اس محکمے کے جس کے ذمہ اِن خواتین کی تین وقت کھانا اور مہینے میں ایک جوڑ کپڑا بھیجنا تھا"[۱۱]۔ اس طرح ناول میں نچلے طبقے کی خواتین کے استحصال کو حقائق کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ تلنگانہ کے مسلم گھرانوں میں مذکورہ مسائل کی وجہ سے لڑکیوں کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مائیں نہیں چاہتی تھیں کہ ایک اور مجبور کو پیدا کریں۔ کہانی کے ایک منظر میں اپنی بیٹی بتول بیگم کی زچگی کے وقت بی بی کی کیفیت اس طرح ہے:

کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے بطن سے اسی کی طرح مجبور اور بے بس ہتی جنم لے۔ اگر اللہ عورت کو یہ اختیار رہتا، اگر بتول کی ساس یہ سمجھتی تھی کہ اس وقت اپنی عاقبت سنوارنا خود اس کی بہو کے ہاتھ میں ہے تو بتول یہاں لیٹی مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی ! انھیں لرزہ کیوں چڑھتا۔ بتول کی ساس اپنی سب سوکنوں پر حکمرانی کیوں کرتی دنیا میں صرف مرد ہوتے جو اپنے مزے میں جی رہے ہوتے۔ نہ خواتین کی طرح ہائے ہائے نہ بچوں کی چیخ پکار زندگی کیسے مزے میں گزرتی۔[۱۲]

بتول بیگم کی بیچارگی اور بے بسی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ بتول بیگم کے بطن سے دو بیٹوں کے بعد غزل پیدا ہو جاتی ہے۔ ساس بہت افسوس کا مظاہرہ کرتی ہے۔

اوئی یہ میری موت پر نگارے کیوں بج رہے؟

ہمایوں کی ماں بیچ آنگن میں دل تھام کر بیٹھ گئی۔

الف لیلہ میں ہے جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اپنے ساتھ ستر بلائیں لاتی ہے۔[۱۳]

بتول بیگم کے علاوہ دیگر گھر کیا فراد کی ندامت سے گردنیں جھک جاتی ہیں۔غم سائے کی طرح ساتھ رہنے لگے' لمحہ لمحہ کے گناہ یاد آنے لگے' بے بسی اور بیچارگی رونما ہونے لگی' نہ ٹلنے والی مصیبت آن پڑی' مزید یہ کہ اس طوفان سے کیسے نجات ہو؟ گ لڑ کے پیدا ہوں تو یوں سمجھا جاتا ہے کہ موسلا دھار بارشوں کی طرح برکتوں کا نزول ہونے لگا وہ خبر جس کے سننے کے لیے کان منتظر تھے۔لیکن بچیاں سے متلق اس کے برعکس ذہن چلتا ہے۔وہ پیدا ہوتے ہی اس کے ساتھ سخت رویہ رکھا جاتا ہے۔حلاں کہ جو ہاتھ اٹھنے کے قابل نہیں، پاؤں چلنے کی سکت نہیں رکھتے ،زبان بولنے کی طاقت سے محروم ہے، دماغ اور سوچ وفکروں کی گہرائیوں سے خالی رہتا ہے۔لیکن اپر منحوسی کا نشان لگا دیا جاتا ہے۔جس کی پیدائش پر مایوسی کے گیت گنگائے جاچکے ہیں۔وہ کیسے مسرتوں کا سبب بن سکتی ہے۔

غزل کی پیدائش ان ہی حالات میں ہوتی ہے۔اس کی ماں بتول بیگم ایک ایسی عورت تھی جو مرد کے ظلم وستم سہ سہ کر مر جاتی ہے۔لیکن 'بی بی' اس نظام کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔لنگڑی پھوپھو بھی عمر کے آخر میں معاشرہ سے بغاوت کر کے شیخو بھائی سے عقد کر لیتی ہے۔کیوں کہ بھائی دولت کی خاطر شادی سے روکتے ہیں۔یہاں تک کے اس کا پیر توڑ دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ کنوری بوڑھی ہو جاتی ہے۔پھر بھی وہ مرد معاشرے کے اصولوں کو سہتی رہتی ہے۔لیکن جب وہ حقوق سے آگاہ ہو جاتی ہے تو وہ ترپن برس کی عمر میں اپنی مرضی سے شادی کر لیتی ہے۔مصنفہ نے جو لاعلمی کے تحت بے اصول چیزوں کو تہذیب اور تمدن بنا رکھا ہے۔یہ طرز عمل ان گھرانوں میں بھی ہے۔جو اپنے آپ کو باشعور تصور کرتے ہیں' دینی علم رکھنے والے بھی دندناتے ہوئے کہتے ہیں ہمارے دل کی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیٹوں سے نوازے کوئی ایسا گھرانہ نہیں جس میں بچی کی پیدائش پر اس طرح فرحت محسوس کی جائے۔[۱۴]'بی بی' کا کردار ناول میں خموش نظر آتا ہے۔لیکن وہ اندر ہی اندر جاگیردارنہ نظام کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔وہ ہرگز جاگیرداروں سے شادی کرنا پسند نہیں کرتی۔کیوں کہ وہ مرد بیک وقت چار چار بیویاں، لونڈیاں اور داشتائیں بھی رکھتے ہیں۔اتنی نفرت ہونے کے باوجود مجبوراً ساتھ رہتی ہے۔"انھوں نے واحد حسین کی تیز وتند خواہشوں کو بھی برداشت کیا اور ان کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے بڑھاپے کو بھی سہا، مگر انھوں نے واحد حسین کو کبھی اپنا کہہ کر مخاطب نہ کیا۔تمہارے نانا، تمہارے ابا۔تمہارے بھائی۔تمارے دادا۔وہ واحد حسین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں کو سونپتی رہیں"۔[۱۵]پھر بھی وہ خاموشی سے اپنی شکست بھول جاتی ہے۔بی بی جوں جوں ہٹتی جاتی ہے واحد حسین تشنہ عاشقوں کی طرح آگے بڑھتا ہے۔اسے پانے کی آرزو میں پیچھا کرتا رہتا ہے۔بی بی ایک مجبور خاتون ہے جو نا چاہتے ہوئے بھی ایسے ماحول میں رہتی ہے جو اسے پسند نہیں ہے۔" بی بی اس گھر میں یوں رہتی تھیں جیسے کسی صحرا میں گلاب کا قلم لگا دیا ہو۔اور اسے زبردستی پھلتا پھولتا دیکھئے تیس برس گزرنے کے باوجود ان کی جڑیں اس زمین میں پیوست نہیں ہوئی تھیں۔وہ اس چڑیا کی طرح رہتیں جسے یقین ہو کہ ایک دن پنجرہ کا دروازہ کھلے گا اور وہ کسی پھولوں سے لدی شاخ پر جا بیٹھیں گی۔[۱۶]یہاں جس خاتون کی پیش کشی ہوئی وہ مرضی سے شادی کے لیے منع نہیں کر پاتی ہے۔اور نہ شادی کے بعد ازدواجی زندگی خوشی سے گزارتی ہے۔اسی لیے وہ شوہر سے فاصلہ بنائے رکھتی ہے۔تو شوہر واحد حسین اس طرح سوچتا ہے:

تیس برس ہو گئے انھیں بی بی کا انتظار کرتے ہوئے لیکن آج انھوں نے غور کیا کہ بیوی فولاد کی طرح اپنی جمی ہوئی تھیں البتہ خود ان میں جگہ جگہ نشیب وفراز آ گئے تھے۔۔۔لیکن یہ بھی ایک عورت ہی تھی انھوں نے دوبارہ کرسی گھما کر سامنے بیٹھی ہوئی بی بی کو دیکھا وہ بڑے سکون کے ساتھ بیٹھی ننھے ننھے کپڑے سی رہی تھیں جیسے ان کی زندگی کا اسل مقصد یہی تھا۔وہ دنیا کے سارے ہنگاموں سے اور واحد حسین کے منتشر دماغ سے، ان کے تشنہ بدی سے بالکل ہی

ناواقف تھیں یہی وہ لاپرواہ عورت تھی جس نے محبوبہ بن کران کی زندگی میں سارے رنگ بھیر دیئے تھےاور بیوی بن کر زندگی کا ہر رنگ پونچھ ڈالا۔[۱۷]

وہ اس فرسودہ ماحول اور استحصال پسند معاشرے سے بچ تو نہیں سکتی لیکن اس ماحول میں اپنی مرضی کے خلاف ڈھلتی بھی نہیں۔اسی سے معلوم ہوتا ہے مصنفہ نے بے بس کرداروں میں بھی حسیئت کے پہلو برقرار رکھے ہیں۔ان کرداروں کی اچھی خوبی یہ ہے کہ وہ ظلم و ذیاتیوں کو قبول نہیں کرتیں۔نہ ہی اپنی جیسی خواتین کو پسند کرتی ہیں۔"چاند کی اس بدلی ہوئی روش پر سب زیادہ بی بی خوش تھیں کہ عورت وہ ایک جھونپڑی سے اس دیوڑھی میں آئی تھی اور جانتی تھیں کہ عورت چاہے محل میں ہو یا جھونپڑی میں وہ ایک ہی دائرے میں گومتی رہتی ہے لیکن چاند کو پڑھتے دیکھ کر انھیں آس بندھتی کہ وہ اس دائرے کو توڑ کر نکل جائیگی"۔

جدت پسند کرداروں میں غزل، قیصر، چاند اور کرانتی ہیں۔ ان میں چاند کا کردار اہم ہے۔ وہ حسین اور شریر ہے۔آزادانہ ماحول میں پلی ہے۔اس کے والد حیدر علی خاں ترقی پسند ہیں۔نانا واحد حسین چاند کی فیشن پرستی کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اسے منع نہیں کرتے۔حالاں کہ چاند چودہ برس کی عمر میں نارائنا سے عشق کر کے ناکام ہوجاتی ہے۔چاند والدہ کی موت کے بعد دوسری ماں کے ساتھ رہنے کے بجائے ایوان غزل پہنچ جاتی ہے۔ جہاں وہ مکمل آزادانہ زندگی گزارتی ہے۔اس کے بعد چاند اپنی ساری آسائشوں کو بھول کر کمیونسٹ سنجیو سے عشق کرتی ہے۔ لیکن وہ بھی اس کو ٹھکرا دیتائی ہے۔جس کی وج ہسے چاند ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے۔آخر کار چاند، سنجیوا کی بیٹی کرانتی کو گلے لگا کر مرجاتی ہے۔اس طرح چاند پوری کہانی میں استحصال کی شکار ہے۔

قیصر بھی چاند کی طرح اس گھٹن بھرے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ وہ واحد حسین کی نائز اولاد فاطمہ بیگم کی بیٹی ہے۔ اس پر بھی ظلم وستم ہوتے ہیں لیکن وہ چاند اور غزل کی طرح زیادتیوں کو برداشت کرنے بجائے اس کا مقابلہ کرتی ہے۔جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو سکے۔لیکن اسے بغاوت کے الزام میں پھانسی دی جاتی ہے۔ پھر وہ ڈٹ کر موت کو گلے لگا لیتی ہے۔وہ اس نظا کو بدلنا چاہتی ہے۔اس سلسلہ میں وہ غزل سے کہتی ہے"رونا چھوڑو غزل۔ بلکہ اپنی یہ روش بدلو' قیصر نے اسے گلے لگا کر کہا" چاند کی طرح مردوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔جسم کے علاوہ دماغ بھی تو ہے تمہارے پاس وہ کیوں نہیں بیچتیں"۔[۱۸] قیصر زندگی کو آزادانہ جینا پسند کرتی ہیں۔وہ دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہے۔ وہ حالات کو بدلنے کا عزم رکھتی ہے۔اور نہ وہ غزل اور چاند کی طرح بے راہ روی کی شکار ہوکر اپنی عزت نفس کو ٹھیس نہیں پہنچنے دیتی ہے۔ وہ ہر حالات کا سامنا کرنے کا ہنر جانتی ہے۔اسی لیے وہ کمیونسٹ پارٹی کی تحریک سے بھی جڑی رہتی ہے۔ وہ غزل سے کہتی ہے شادی کے بندھن میں پھنسنے کی کوئی ضرورت نہیں"میں کیوں کرتی اس کے ساتھ شادی۔شادی کے بعد زندگی بھر مجھے اس کی بات ماننا پڑتی اور وہ مجھ سے ایثار وقربانی کی اُمید لگا تا میاں بیوی مکمل آزادی کے ساتھ کہاں رہتے ہیں اور میں تو ایسا کبھی نہیں کروں گی کہ دل نہ چاہیے پر بھی اپنے شوہر کو دھوکا دیئے جاؤں"۔[۱۹]

ناول کی مرکزی کردار ویسے تو غزل ہے لیکن دیگر نسوانی کرداروں نے بھی اہم رول ادا کیے ہیں۔غزل نفسیاتی الجھنوں میں گھری ہوئی ہے۔غزل کا بچپن چاند کے برعکس فرسودہ ماحول میں بڑی لاپرواہی سے گزرا ہے۔ جہاں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔وہ بچپن سے ماں کی بے بسی اور باپ کی بے حسی کے درمیان گزا ہے۔وہ اپنے ماموں زاد بھائیوں کی آرام وآسائش سے بے حد متاثر رہتی ہے۔غزل کے والدہ کی بے وقت موت اور باپ کی عدم توجہی سے محبت کی بھوکی رہتی ہے۔ یہاں تک وہ جذباتی ا عتبار سے بکھر جاتی ہے۔جس کی وجہ سے دوسروں کو بھی محبت کرتا دیکھ کر تڑپ جاتی ہے۔جس کا ثبوت ناول کا ایک منظر میں"لیمواور

مٹھائی کھاتے دیکھ کر تو سب ہی کے منہ میں پانی آتا ہے گر بچے کو اس کی ماں سے پیار کرتے دیکھ کر غزل کو تو جیسے بھوک بھڑک اٹھتی ہے۔[20] یہاں تک کہ غزل کی چھٹی حس نے اتنی ہی عمر میں اسے محبت اور نفرت کی نگاہ کو محسوس کر لینا سکھا دیا تھا۔ وہ اپنی جانب محبت سے دیکھنے والی نگاہ پر سات خون معاف کر دیتی تھی کیوں کہ ایسی نگاہیں بہت ملتی تھی۔[21]

ایوان غزل کے مقابل دوسرا خاندان "الف لیلیٰ" ہے اس خاندان میں توہمات اور مذہبی رسوم کی پابندی مسکین علی شاہ طوطا چشمی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بشرہ بیگم اور ان کے شوہر حیدر علی خان نمایاں ہیں اور یہ مغربی تہذیب کے شیدائی ہیں۔ حیدر علی خان کا گھرانا واحد حسین کی بڑی بیٹی بشیرا بیگم کا سسرال ہے۔ یہ لوگ شراب نوشی، لب لائف، سوئمنگ پول میں نہانا، نیم عریاں لباس پہننا جدید طرز زندگی قرار دیتے ہیں۔ واحد حسین عمر کے آخری اسٹیج پر حسن نسوانی کا زیادہ ہی دلدادہ ہو گئے ہیں۔ وہ جدید فیشن کی عورت سے شدی کر کے اپنے زوال کی طرف گامزن ہیں وہ (ان کی بیگم) بقول مصنفہ "خود ساری ذمہ داریوں سے الگ تھلگ بناو سنگار کی خوشبو میں بسے ہوئے چم چم کپڑے پہنے کلائیوں میں سنہرے رنگوں کا جوڑا، چمکاتی سمہری پر بیٹھی رہتی تھیں یا پھر ناول پڑھنے میں وقت گزرتا تھا۔[22] لیکن اس ابّا اسے ہر بات پر مارتے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ مارنے کے بعد کبھی باب اسے اپنے گلے سے لگا لے گا۔ اس طرح کے حالات سے وہ تنگ آ کر اسکول کی سرگرمیوں میں کھو جاتی ہے۔ جہاں مس ڑیڈی اس پر توجہ دیتی ہے تو سہ ہر سبق یاد کر لیتی ہے۔ لیکن مس ریڈی بھی شادی کے بعد اس پر توجہ کم کر دیتی ہے۔ ایک مرتبہ فوزیہ غزل سے شادی کی باتیں کرتی ہیں اپنے شوہر اور بچوں کے خواب دیکھتی ہے تو غزل بھی اپنے بارے میں سوچتی ہے۔" کیا میری بھی شادی ہو گی! غزل نے پہلے کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی اب بھی یہ بات تو سبھی جانتے ہی ہوں گے کہ زیادہ سینت کر رکھنے سے لڑکیاں مچھلیوں کی طرح سڑ جاتی ہیں۔[23] اسی لیے جب گھر میں لڑکیوں کو پیار نہ ملے تو وہ باہر ڈھونڈتی ہے۔ بھان صاحب کی توجہ سے پگھل جاتی ہے۔ اور جب بلگرامی اس سے کہتا ہے کہ وہ اس کی خاطر ملنے آیا ہے تو غزل کہتی ہے میری خاطر میری خاطر میری خطر اس آدمی پر چاند سے لے رضیہ ممانی تک مرتی تھیں۔ یہ خوبصورت شہزادوں کی صورت ہیرو میرے لیے۔ یا اللہ آج کیا ہو رہا ہے کہیں میں مرن نہ جاؤں۔ بھان صاحب اور بلگرامی کے بعد غزل پھر نصیر سے ملتی ہے اور اسے اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے۔ "نصیر کے پیار کی گرمی اس کے لیے بہت پرانی سی بات ہو چکی تھی وہ بالکل گرہست بیویوں کے انداز میں اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتی تھی اس بدن میں کیا تھا جسے بچائے پھرتی؟ اس نے تو اپنی روح پہلی بار ایک مرد کو سونپی تھی اور اس کے بعد ہر چیز بھول جانا چاہتی تھی"۔[24] اس کے باوجود غزل کو نصیر بھی بلگرامی کی طرح چھوڑ جاتا ہے۔ غزل دوبارہ تنہا ہو جاتی ہے۔ جب فوزیہ نکاح کے وقت روتی ہے تو غزل سوچتی ہے "پاگل میں ہوتی تو اسی خوشی کے مارے مر جاتی کسی ایک کی ہو کر مر جانے کا سکھ کیسا ہوتا ہو گا! مجھے فوزیہ کی زندگی کا ایک ہی لمحہ مل جائے تو اچھا ہے۔[25] اس کردار میں محبت کے لیے ہر کام خوشی خوشی نبھانے کا جذبہ ہے۔

غزل بچپن میں اسٹیج پر کام کرتی ہے۔ غزل کی زندگی میں کئی مرد آتے ہیں ہر دفعہ وے دھوکہ دہی کا شکار ہوتی ہے۔ غزل ہمیشہ ایک متعدد مرد کے لیے تبدیل ہوتی رہی لیکن اسے حقیقی چاہت نہ مل سکی۔ بلگرامی اپنی محبت کے جال میں غزل کو پھانستا ہے۔ نصیر منگنی کی انگوٹھی پہنا کر پاکستان چلا جاتا ہے۔ غزل بھی نصیر کو چاہنے لگتی ہے اور نصیر کا انتظار بھی کرتی ہے۔ پھر غزل کی زندگی میں سرور آتا ہے لیکن غزل سرور کی دام محبت میں نہیں پھنستی۔ سرور کو غریبی کی وجہ سے ٹھکرا کر ایک ڈاکٹر سے شادی کر لیتی ہے۔ اُسی اثنا میں نصیر پاکستان سے آ جاتا ہے اور اپنی منگنی کی انگوٹھی واپس لینے کے لیے غزل کے قریب آتا ہے۔ غزل بھی نصیر کی محبت میں

مبتلا ہو جاتی ہے۔ نصیر جب انگوٹھی غزل سے واپس لے لیتا ہے یہ صدمہ غزل برداشت نہیں کر پاتی اور مر جاتی ہے۔ اس کی وفات کے بعد نصیر کرانتی سے تعلقات بڑھاتا ہے۔ لیکن کرانتی بہت ہوشیار لڑکی ہے۔ نصیر کے جال میں نہیں پھنستی اور نصیر سے دور رہتی ہے۔

غزل اپنے جسم کا سودا تو محبت کی تلاش میں کئی مرتبہ کر چکی تھی۔ دل اور روح اس نے نصیر کو سونپا تھا۔ وہ اسے دھوکا ہی دیا۔ وہ مردوں کے لیے ایک ٹشو پیپر کی طرح تھی۔ اس کے ماموں زاد بھائی اس پر ترس کھا کر شاہین شادی کر لیتا ہے۔ غزل شادی کے بعد بھی بیوی نہیں بن پائی۔ بلکہ وہ خود اس کی خامہ ہی سمجھتی رہی کہ اوروں کی طرح جسم کا مطالبہ ہی شاہین کو میری طرف کھینچ لایا ہے۔ اسی لیے شاہین کو بس فرض سمجھ کر نبھاتی۔ ان کے بھائی احمد حسین بھی اجالا بیگم سے پراسرار طور پر شادی کرتا ہے۔ وہ اونچی پوری مہیم شہیم عورت ہے، واحد حسین کا بیٹا راشد ہی وہ ذریعہ ہے۔ جس سے وہ کسب زر کرتے ہیں۔ لیکن وہ عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ کے ایک انجینئر کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس کی شادی کی ایک بڑے کاروباری کی بیٹی رضیہ سے کی جاتی ہے۔ وہ مغربی تہذیب کو پسند کرتا ہے۔ اسی لیے ماڈرن طرز پر جینا چاہتا ہے۔

بشیرا بیگم کی بہن غزل کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جس میں عورت کی کوئی وقعت نہیں تھی اس کی ماں مسلسل اس کے باپ ہمایوں کے برے برتاؤ کا شکار رہی۔ بچپن سے ہی اس نے ماں کی بے چارگی اور باپ کے ظالمانہ رویے کو دیکھا۔ اسی ماحول میں اس کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔ ماں کی بے وقت موت اور باپ کے ظالمانہ رویے نے غزل کو مزید توڑ کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سیکھتی ہے کہ اس کے ماموں اپنے بچوں شاہین اور فوزیہ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ غزل یہ سب دیکھ کر عجیب سے احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ محبت وتوجہ کے دو بول اس کے لیے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی اسے پیار ومحبت کی نظر سے دیکھ لے تو وہ اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ "اپنی جانب اٹھنے والی ہر نگاہ کو وہ بڑے غور سے دیکھتی تھی۔ غزل کی چھٹی حس نے اتنی ہی سی عمر میں اسے نفرت اور محبت کی نگاہ کو محسوس کرنا سکھا دیا تھا۔ وہ اپنی جانب محبت سے دیکھنے والی نگاہ پر سات خون معاف کر دیتی تھی۔..... اس شخص کے سارے عیب پر لگا کر اڑ جاتے تھے۔ پھر وہاں امید کی ایک کرن پھوٹتی، ایک پتہ سر اُٹھا کیا دھرا دھر دیکھتا اور اپنی گردن زیادہ لمبی کر دیتا پھر ایک پنکھڑی پنکھ کھولتی ارایک بیل غزل کی رگ رگ کو جکڑ لیتی۔ ۲۶

محبت کی یہ تلاش غزل کو غلط راہ پر لے جاتی ہے۔ جب بھی کوئی اس سے نرمی ومحبت سے بات کر لیتا یا اس کی تعریف کر دیتا تو وہ اس کی اسیر ہو جاتی۔ یہی سبب ہے کہ زیادہ تر معاشقوں میں ناکامی اس کا مقدر ٹھہری اور جب ایک بوڑے سے اس کی شادی طے کر دی گئی تو بھی وہ کچھ نہیں کہہ پائی خاموشی سے اس شادی کے لیے تیار ہو گئی۔ عصمت چغتائی اس پر سخت تنقید کی ہے۔" غزل نہایت احمق اور ڈھیلی عورت ہے۔ اپنے کنوارے پن کو کھو کر سمجھتی ہے سب کچھ کھو دیا۔۔۔ غزل ضرورت سے زیدہ بیوقوف ہے۔ تعجب ہے کہ بانو کو اسے اپنی ہیروئن بنانے میں کیا مصلحت نظر آئی ۲۷۔ غزل اپنی اسی کمزوری کے سبب کبھی مطمئن نہیں رہ پاتی یہاں تک کہ شادی کے بعد بھی وہ نصیر کو یاد کرتی ہے اور جب نصیر اس سے اپنی انگوٹھی لے لیتا ہے تو وہ اس حادثہ کو برداشت نہیں کر پاتی اور موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ ناول کی دوسری اہم کردار چاند ہے۔ غزل کی بربادی کا ذمہ دار اس کا باپ ہمایوں ہے جب کہ چاند کا ماموں راشد سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جیلانی بانو نے لکھا ہے۔ راشد ترقی پسند نہ تھا مگر مصلحت پسند ضرور تھا۔ اس نے انجینیر ی کے علاوہ بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ مٹی چونے اور پتھر کا بیوپار۔ وہ بزنس کیا صول پڑھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ چاند جیسی تہذیب یافتہ اور فیشن ایبل لڑکیوں کا بھاؤ کتنا بڑھا ہوا ہے۔ اتنا کہ لوگ چاہیں تو ان کے سہارے لاکھوں کے کنٹریکٹ

لے لیں۔۲۸؎

راشد نے چاند کو ہر ممکن طور پر اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔لیکن جب چاند سنجیوا (جو ایک کمیونسٹ نوجوان تھا) کے عشق میں گرفتار ہوئی تو بی بی اور غزل کو چھوڑ کر سارا گھر اس سے خفا ہو گیا۔چاند نے جب اس حقیقت کو محسوس کیا تو اس نے غزل کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔میں تو چھبیس برس میں موت کے کنارے کھڑی ہوں لیکن غزل تو بی خود چلنا چھوڑ دے۔اپنی تقدیر خود بنانے کا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا۔اس لیے اپی باگیں بی بی کے ہاتھ میں تھما دے ورنہ راشد ماموں اور خالو پاشا تجھ سے اپنی کامیابیوں کے فقل کھولیں گے اور تجھے پھینک دیں گے۔۲۹؎ اور یہی ہوا بھی جب سنجیوا چاند کو ہزار کوشش کے باوجود اپنا بنانے کو تیار نہیں ہوا تو وہ تپ دِق کا شکار ہو کر مر گئی یہی انجام غزل کا بھی ہوا۔ نصیر کے انگوٹھی واپس لے لینے کے غم کو غزل برداشت نہ کر سکی۔اور اس طرح روح پرواز کر گئی۔جس میں حیدرآباد کی پرشکوہ تاریخ، کسانوں کی حالت زار اور تلنگانہ بغاوت کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا۔ اردو فکشن میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ بی بی واحد حسین کی بیویوں میں سے ایک ہے۔ جیسے ''پانچ ہزار کے نقد کے لالچ نے منشی صاحب کو پگھلا دیا۔ ایوان غزل کے سب سے بڑے ہال'' بہت الغزل ''میں بی بی دلہن بنی اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔جب چار مضبوط خواتین نے مل کر نکاح کے اقرار کو ان کی گردن پکڑ کر بلائی تو وہ بے ہوش ہو گئیں اور ذلہا کے بدلے سب سے پہلے ان کی صورت حکیم نے دیکھی۔۳۰؎ بی بی بی بہت بھولی اور معصوم تھیں۔دنیا سے بے خبر اپنا حق مانگنے کی پردہ نہیں:

بی بی بڑے ٹھنڈے خون کی تھیں اور تین برس گزرنے کے باوجود وہ اپنے کو ایوان غزل کی ملکہ کے بجائے ایک چپراسی کی لڑکی ہی سمجھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے سارے اختیارات لنگڑی پھوپھو کو سونپ دیئے تھے اور خود سارے گھر کی ذمہ داریوں سے الگ تھلک بناؤ سنگار کے خوشبوؤں میں بسے چم چم کرتے کپڑے پہنے کلدیوں میں سنہرے نگوں کا جوڑا چمکاتی مسہری پر بیٹھی رہتی تھیں۔یا پھر ناولیں پڑھنے میں وقت گزرتا۔ماماؤں سے شہر کی اہم خبروں پر تبصرہ ہوتا۔یا پھر پردہ لگی موٹر میں بیٹھ کر وہ رشتہ داروں کے ہاں ملنے چلی جاتیں۔انھیں بالکل خبر نہ ہوئی کہ آج گھر میں امباڑے کی بھاجی پکی ہے یا پالک کی۔ واحد حسین کا کن کن چیزوں سے پرہیز ہے۔البتہ واحد حسین کمرے میں آتے تو وہ نئی دلہن کی طرح سمٹ کر بیٹھ جاتیں۔ان کی ہر خواہش پر حکم کو بصد چشم قبول کرنے کو تیار۔واحد حسین نے بھی بی بی کو اپنی ساری چابیاں سونپ دی تھیں۔ یہ وہ عورت تھی جس نے پچیس برس کی عمر میں پچیس عشق کرنے والے واحد حسین کو اپنے پاس بٹھایا تو پھر وہ کسی طرف نہ دیکھ سکے۔مگر اس ڈیوڑھی میں لاکر تین بچوں کی ماں بنا کر بھی بی بی ان کے ہاتھوں نہیں آئی تھیں۔۳۱؎

ایوان غزل کی علامت اختتام پر ماضی کی ایک شاندار تہذیب کے انہدام کے استعارے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اور یہ بتاتی ہے کہ وقات کے بے قابو اور بے روک ٹوک سفر میں تہذیب کے درخت کا پنا ایک فطری حیاتیاتی نظام کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس پر دردناک تبدیلیوں کی خزان بھی آتی ہے اس کے پتے جھڑنے لگتے ہیں، لیکن کائنات کے اس رستاخیز میں نئے پتے دوسرے مختلف رنگوں میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔کیوں مصنفہ نے پختہ اور باشعور فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے، واقعات ماحول ومعاشرت سے اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ تاثر میں انتشار پیدا نہیں ہوتا جاگیردارانا ماحول، معاشرت، شادی بیاہ کے رسم ورواج ، جہیز کے کپڑے، میراثنوں کے گیت وغیرہ اتنے دلکش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری خود کو اسی فضا میں کھو جاتا ہے۔

کہانی کا مرزی کردار غزل ہے۔وہ ہمایوں علی شاہ کی بیٹی ہے اس کی ماں بتول بیگم ہے جو انتقال کر جاتی ہے۔غزل کی پیدائش بچپن، جوانی اور شادی شدہ زندگی کی تصویر مکمل طور پر ابھرتی ہے۔غزل خوبصورت ہے، لیکن وہ ایک ایسے ماحول میں

پلتی ہے جو زوال آمادہ ہے۔اس کی ماح مجبوری کی زندگی گزارتی ہے۔باپ اس سے غافل رہتا ہے، بچپن ہی سے وہ اپنے آپ کو اکھی اورا کیلی محسوس کرتی ہے اور کسی کے اظہار محبت پر تسکین محسوس کرتی ہے۔وہ اپنی جانب دیکھنے والی نگاہ پر خوف معاف کر دیتی تھی کیوں کہ ایسی نگاہیں کم ملتی تھیں۔وہ اپنی خالہ زاد بہن چاند کی محبت سے بہت متاثر تھی اور اس کے کہنے پر اس اداکاری میں دلچسپی لی اور بھان صاحب نے اس پر فریفتہ ہو کر اسے بھارت کلا مندر میں شامل کیا، وہاں وہ بلگرامی صاحب کے قریب ہوگئی، بلگرامی اسے اپنے ہوس کا نشانہ بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔اس کے بعد وہ نصیر سے ملتی ہے جو اس کے حسن سے متاثر ہوتا ہے اور وہ اپنا سب کچھ اس پر نثار کرتی ہیاس دردناک کہانی میں ایک نیا موڑ اس وقت آتا ہے جب وہ اپنے ماموزاد بھائی سے شادی کرتی ہے، اس کا نام شاہین ہے۔اتنے میں نصیر پاکستان سے بیوی بچوں سمیت حیدرآباد آتا ہے۔اس سے مل کر اس کے دل میں پھر محبت جاگتی ہے۔لیکن نصیر اس کی دی ہوئی انگوٹھی واپس لیتا ہے۔یہ اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔اس کی زندگی کے یہ سارے واقعات اس کی جذباتیت کو ظاہر کرتے ہیں اور یہی جذباتیت اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔اس طرح ایک خوبصورت لڑکی کا متواتر استحصال ہوتا ہے۔

'چاند' بھی زندگی کے نشیب وفراز سے گزرتی ہے۔وہ بشیرا بیگم کی بیٹی ہے وہ مغربی طرز زندگی سے دلچسپی رکھتی ہے اور یہی اپناتی ہے کیوں کہ اس کے والد حیدر علی خان ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں۔ چاند اپنے ماموں زاد بھائی راشد کو پسند کرتی ہے۔ راشد جانتا ہے کہ پرانا نظام حیات ٹوٹ رہا ہے، وہ اسے کسی نہ کسی صورت میں قائم رکھنا چاہتا ہے وہ انجینئر ی کے ساتھ کاروبار بھی کرتا ہے اور اپنے ستھ چاند جیسی تہذیب یافتہ خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکی کر رکھنا چاہتا ہے۔تا کہ اسے لاکھو کا کنٹریکٹ ملے۔چاند ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتی ہے لیکن آزادی کے ساتھ سٹیج ڈراموں میں بھی کام کرتی ہے۔وہ شوک، آزاد خیال اور با اعتماد لڑکی ہے۔وہ سنجیوا سے محبت کرتی ہے لیکن اس کی طرف سے بے اعتنائی سے ٹی۔بی کی شکار ہو جاتی ہے۔غزل اور چاند کی زندگی کے واقعات دوسرے کرداروں کو سامنے لاتے ہیں ار کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔عورت کی طرز زندگی، نفسیات ارتو ہمات پر جیلانی بانو نظر رکھتی ہیں۔ دراصل انھوں نے بہت گہرائی سے طبقہ نسواں کے سماجی، گھریلو اور نفسیاتی مسائل کا احاطہ کیا ہے۔

ایوان غزل میں خواتین کی سماجی حیثیت اور ان کے حالات و مسائل کو مزکزی حیثیت حاصل ہے۔ جاگیر درانہ معاشرے میں اعلیٰ طبقے ار نچلے طبقے کی خواتین کی زندگی اور ان کے حالات ومسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس سے نہ صرف اس عہد اور نظام میں ان کی سماجی حیثیت اور مسائل کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ خواتین کی نفسیات، جذبات اور احساسات اور ان کی ذہنی گھٹن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں "خواتین کے مسائل کی حقیقی عکاسی اس ناول میں مختلف خصوصیات کے حامل طرز معاشرت کے ذریعہ کی گئی ہے۔ واحد حسین کا 'ایوان غزل' اور ان کے بھائی احمد حیسن کا گھر جہاں جاگیرانہ ماحول معاشرت کے سبھی عناصر مکمل شکل میں موجود ہیں۔اس نظام میں خواتین بے زبان مخلوق تھیں، انھیں محض عیاشی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، کبھی وہ بی بی بن کر کاموشی سے زندگی کا زہر پیتی ہے، کبھی وہ لنگڑی پھو پھو کی طرح معذور کر دی جاتی ہے تو کبھی چاند اور غزل کو چمکتے ہوئے سکوں کی طرح استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی چمک ختم ہوتے ہی پھینک دیا جاتا ہے۳۲۔اسی طرح لنگڑی پھو پھو(گوہر بیگم) کی زندگی سے وابسطہ تمام واقعات، حالات، فوزیہ کی نندر یحانہ کا ایوان غزل آنا، جس کی شادی پاکستان میں ہوئی اور اس کے ذریعے پاکستان جاچکے احمد حسین، اجالا بیگم اور نصیر کے بارے میں حالات معلوم ہونا، غزل اور شاہین کی شادی کا ذکر، نصیر کا بیوی بچوں کے ساتھ حیدرآباد، یہ تماواقعات منطقی ربطہ، تسلسل اور ہم آہنگی کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔

ناول میں نسوانی کرداروں کو تفریح کا سامان قرار تو دیا گیا ہے۔لیکن بدلتے زمانے کے اثرات کے تحت ان کی بیداری اور حقوق منوانے کا جذبہ بھی دکھایا گیا ہے۔لنگڑی پھوپھو ظلم وستم برداشت کرتی رہی ہے لیکن دل میں وہ جذبہ بغاوت بھی محسوس کرتی ہے۔وہ راشد سے کہتی ہے "ارے میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔تم سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہو کبھی مجھے نیچے پھینک دیتے ہو، کبھی چاند کو آگ میں جھونک دیتے ہو۔تمہاری شاعری کی ایسی تیسی۔اس ایوان غزل پر مٹی ڈالوں، جہاں عورت کو لوٹ کھسوٹ کر چھوڑ دیتے ہو۔۳۳؎

'ایوان غزل' میں چاند کے علاوہ رضیہ، اجالا بیگم، شاہین اور فامہ سب اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔مجموعی طور پر ناول حیدرآباد کی تہذیب زندگی کی رنگا رنگی اور اس کے زوال کی کہانی ہے۔یہ ایک خاص معاشرتی زندگی، سیاسی مسائل، رسوم ورواج، مذہبی عقائد، توہم پرستی، لوگوں کے عادات واطوار، جذبہ آزادی، نچلے طبقے کی بیداری، خواتین کی خراب حالت، امراء کی عیش پرستی، خواتین کا جذبا بغاوت، ہوس پرستوں کی سازشیں، ظاہری چمک دمک، اقدار کی بے حرمتی وغیرہ پر محیط ہے۔جیلانی بانو کا طبقہ نسواں کی مجبوری اور احساس محرومی دوسری فکشن نگارات کی روش پر نہیں ہے۔وہ شروع سے پوری آگاہی اور علم کی بدولت علاقائی اور انسانی پس منظر میں خواتین کی شخصیت ان کے خوابوں اور حسرتوں کو محسوس کرتی رہی اروان کو افسانوی اور ناولوں میں پیش کر کے نسوانیت سے اپنی رائے ظاہر کرتی رہی ہیں۔

جیلانی بانو نے افسانوں میں بھی خواتین کی مظلومیت کی حقیقی روداد بیان کی ہے۔ان میں حصول آزادی سے پہلے اس کے بعد کواتین متواتر ظلم وستم سے تنگ آ کر ردِعمل کے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے اور گھر اور سماج کے آدرشوں کو ٹھکراتی ہے۔دل ہی دل میں جذبہ بغاوت کو محسوس کرتی ہے خواہ شادی کا بندھن ہوئی۔اس کے شوہر کا غیر انسانی سلوک ہو، یا کسی اچھے انسان کو پسند کرتی ہو یا اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہو، یا پانی پسند یا ناپسند کا برملا اظہار کرتی ہو، اپنی بات منواتی ہو، اپنے انسانی حقوق طلب کرتی ہو تو اس رویے کی درشتگی کے باوجود مردوں کے عتاب کی شکار ہوجاتی ہے۔یہاں تک کہ اس کے لیے یا تو تمام عمر کڑھنے میں گزرتی ہے یا ایک نامراد زندگی گزارتی ہے یا خودکشی کا ارتکاب کرتی ہے۔منجملہ 'ایوان غزل' جاگیرداروں اور منصب داروں کے گھریلو خواتین کے مسائل اور ان کی تاریکیوں کی داستان ہے۔جہاں مرد محکوم اور طبقہ نسواں ان کی ملکیت ہے۔

ایوان غزل اور بارش سنگ کا تعلق بھی خواتین کی جہالت توہم پرستی پس ماندگی اور لاچاری کو ابھارا گیا ہے۔عورت صدیوں کے جاگیرعارانہ نظام میں برابر تشدد اور مظالم کی شکار ہوتی رہی۔ایوان غزل میں عام کسانوں اور مزدوروں کی پر درد اور مجبور زندگی کو اجاگر کیا گیا ہے۔سماج کے ایک طبقے یعنی خواتین کے سارے حقوق ختم کر دیے گئے تھے۔عورت کو دولت مندوں اور اہل اقتدار کی ہوس کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔جیلانی بانو نے اپنے ناولوں میں خواتین کی مظلومیت کے ساتھ ان کے دل میں استحصال قوتوں کے خلاف جذبہ بگاوت کی ترجمانی کی ہے۔ایوان غزل میں خواتین کی گھریلو اور سماجی حیثیت ان کی بے بسی اور مجبوری کو اجاگر کیا گیا ہے۔خواتین کو صرف بچے جننے، گھر کا کام کرنے اور ساہوں کاروں اور زمینداروں کے یہاں بندھوا مزدور بن کر کام کرنے اور ساتھ ہی ان کی عیاشی اور ہوس کاری کا سامان کرنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ایوان غزل کے بیشتر نسوانی کردار محترک اور فعال ہیں۔ان میں کسی طرح کی پیچیدگی یا الجھاؤ نہیں ملتا۔یہ کردار حیدرآباد کے زوال آمادہ مخصوص نظام میں خواتین کے استحصالی رویوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ایوان غزل کے تمام نسوانی کردار استحصالی رویوں سے دوچار بھی ہوتے ہیں۔ان کرداروں کی ایک جہت ایسی بھی ہے۔جو انہیں منفرد کردار کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے۔ان نسوانی کردار

کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔اس کی پیدائش سے لے کر موت تک ایک ایک لمحے کی تصویر یا خدوخال ابھارے گئے ہیں۔اس کی شخصیت کی تشکیل جس انداز سے کی گئی ہے اس سے تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔بچپن سے ہی غزل اپنے عزیزوں کی بے حسی اوران کی شفقت و محبت سے محروم رہتی ہے۔ماں کی اچانک موت اور باپ کی خواہ مخواہ ڈانٹ پھٹکار اور ایوان غزل کے لوگوں کا توہین آمیز رویہ، گو یا غزل کو ہر جگہ بے بسی اور بے چارگی نصیب ہوتی ہے۔اسی لیے عصمت چغتائی نے غزل کی کردار نگاری پر اشاروں میں طنز کیا ہے۔"غزل نہایت احمق اور ڈھیلی عورت ہے۔اپنے کنوارے پن کو کھو کر سمجھتی ہے سب کچھ کھو دیا......غزل ضرورت سے زیادہ بے وقوف ہے تعجب ہے کہ بانو کو اسے اپنی ہیرئن بنانے میں کیا مصلحت نظر آئی۔"۳۴

مفروضے

1. ایوان غزل کا مرکزی خیال جاگیردرانہ نظام میں خواتین کا استحصال اور وہ اس ماحول سے تنگ آ کر موت کو پسند کر لیتی ہیں یا پھر ان کا مقابلہ کرتی ہیں۔
2. ناول حیدرآباد کی مسلم خواتین کے مسائل پر مبنی ہے۔
3. ناول کے تمام نسوانی کردار پدری نظام کے ماتحت مجبور اور بے بس ہیں۔وہ نا چاہتے ہوئے بھی مردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔
4. ناول کے تمام نسوانی کردار مجبور ہیں۔وہ حالات کا سامنا کرنے کا ارادہ تو کر لیتی ہیں لیکن ٹھوس اقدامات نہیں اٹھا پاتی ہیں۔

مقاصد

1. جاگیردرانہ معاشرے میں خواتین کے استحصال کی نشاندہی کرنا۔اس کی وجوہات معلوم کر کے حقائق کی تلاش کرنا۔
2. حیدرآباد کے مسلم گھرانوں میں طبقہ نسواں کا مقام مرتبہ ناول کی روشنی میں معلوم کرنا۔
3. ناول کے نسوانی کرداروں کی مجبوریوں کا جائزہ تاریخ کی روشنی میں لینا۔کیوں کہ مسلم خواتین زیادہ تر مردوں کی جنسی ہوس کا نشانہ بنتی تھیں۔ان حقائق کی تلاش کرنا۔
4. جیلانی بانو کی بنیادی فکر کا جائزہ لے کر حیدرآباد کی خواتین کے مسائل کی نشاندہی کرنا۔

ماحصل

جیلانی بانو''یوانِ غزل'' میں مسلم خواتین کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔وہ کس طرح نسلی و جسمانی تشدد کی شکار ہوتی رہتی ہیں۔ان کے کرب کو زبردست منظر کشی کی ہے۔انھوں نے مسلم گھرانوں میں پنپنے والے ان مسائل کو بے پردہ کیا ہے۔جن کا ذکر اس سے قبل نہیں ملتا۔ناول میں جیلانی بانو نے واحد حسین ان کے بھائی احمد حسین، واحد حسین کے سسر مسکین علی شاہ طوطا چشمی کے گھرانوں کے مسائل نسواں بھی پیش کیے ہیں۔واحد حسین ایک موقع پرست کے ساتھ ساتھ قدامت پرست ذہنیت کے مالک تھے۔موقع محل گرگیٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ان کے نقش قدم پر ان کا بیٹا راشد چل پڑا۔دوسرا گھرانہ ان کے داماد حیدر علی کا تھا۔جو ترقی پسند ذہنیت کے مالک ہیں۔اسی طرز پر اپنی بیٹی''چاند'' کی پرورش کرتے ہیں۔جو ایم بی بی ایس بننا چاہتی تھی مگر آزاد خیالی اور بے راہ روی نے اسے بے پرواہ اور لا پرواہ بنا دیا۔اپنے چاہنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا۔اپنے پڑوس میں مقیم نارائنا نامی لڑکے سے اس نے عشق کا دم بھرا اور نارائنا کی جدائی میں اس نے زہر کھا کر خودسوزی کی کوشش کی۔اسی طرح چاند کی عمر بڑھتی گئی اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔جس میں شاہد، کمار سوامی، شاعر سحر، وائیلنسٹ جوزف اور رحمان شامل ہیں۔

ناول کے مرد کردار غزل کا جنسی استحصال کرنا چاہتے ہیں۔غزل کی عجیب وغریب ذہنی کشمکش، اور طبعیت کے لیے اس کے والدین، نانا اور ماموبرابر کے شریک تھے۔جنھوں نے چاند کو یا تو حد سے زیادہ آزادی دی یا پھر اپنے مقاصد کے تحت اس کا

کردار بنایا۔اس ضمن میں قمر رائیس کا خیال ہے "جیلانی بانو نے اپنے ناول میں حیدرآباد کے جاگیر دارانہ نظام کے زوال کی داستان، تیکھے احساس اور گہرے سماجی شعور کے ساتھ بیان کی ہے۔وہ اس نظام میں ہر طرح کے استحصال کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ناول میں جاگیر دارنہ نظام میں خواتین کسی نہ کسی رُخ سے استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔اسی وجہ سے دبی دبی سی بغاوت کا جذبہ رکھتی ہیں۔انہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ عورت کو وہ کچھ نہیں ملا جس کی وہ حقدار تھی۔

ناول کے دیگر نسوانی کردار بھی سگھڑ بیوی جو ہر دم شوہر کے آرام وآسائش کا خیال رکھتی ہیں۔حویلیوں ،محلوں ، اور ایوانوں میں خواتین کی زندگی ایک مخصوص دائرے کے گرد گھومتی ہے۔چاند اور غزل کے بے رحمانہ انجام کے حوالے سے مصنفہ نے آرٹسٹ، روشن خیال اور سوسائٹی کی جان لڑکیوں کی حقیقی کردار نگاری کرتی نظر آتی ہیں۔جولالچی ہوس پرست اور بے حس مردوں کی جانب سے اکثر دھوکے دینے والی دنیاں اپنے اپنے خوابوں اور آرزوؤں کے عقوبت خانوں میں محصور نظر آتی ہیں۔آخر میں نا آسودگی اور لا حاصلی کا عذاب سمیٹتی ہی۔ایوان غزل کی علامت اس کے اختتام پر ماضی کی ایک شاندار تہذیب کے انہدام کے استعارے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔اور یہ بتاتی ہے کہ وقت کے بے قابو و بے روک ٹوک سفر میں تہذیب کے درخت کا اپنا ایک فطری وحیاتیاتی نظا کام کرتا نظر آتا ہے۔اس پر دردناک تبدیلیوں کی خزاں بھی آتی ہے۔

مشاہدات

جیلانی بانو 'ایوانِ غزل' کے نسوانی کرداروں کے ذریعے مسلم گھرانوں کا ذکر پیش کرتی ہے ۔ وہ نہایت ہی پست درجے کی ہیں۔ ہر وقت مرد ماتحت اپنی مرضی سے رہتی ہیں۔غیر فطری عمل ہے۔ چوں کہ کبھی بھی حیدرآباد میں اس طرح کی ناقص العقل طبقہ نسواں نہیں تھیں۔مسلم گھرانوں کی خواتین ایک تو دینی تعلیم سے آراستہ تھیں اور عصری تعلیم بھی حاصل کرتی تھیں۔تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کسی بھی اعتبار سے مردوں کی جنسی استحصال کی شکار ہوتی رہیں۔محقق کے خیال میں مصنفہ نے حیدرآباد کی مسلم خواتین کا ایک ہی رخ دیکھا ہے ورنہ کہانی کا مرکزی خیال ضرور بدل جاتا۔

حوالہ جات

1۔ نیلم فرزانہ،اہم خواتین ناول نگار،ص296،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،1992ء

2. جیلانی بانو نقوش آپ بیتی نمبر ادارہ فروغ اردو لاہور، جون 1992ء

3. ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے بدلتے تناظر (تنقید)،ص151،اردو اکیڈمی پاکستان،2007

4. جیلانی بانو،ایوان غزل،ناولستان،نئی دہلی،ص449،،1976

5. جیلانی بانو،ایوان غزل،ص109،ناولستان جامعہ نگر، دلی،1976ء

6. انور پاشا،ڈاکٹر،''ہندو پاک میں اردو ناول،ص94۔،پیش رو پبلی کیشنز،نئی دہلی،۲۹۹۱ء

7. جیلانی بانو،ایوان غزل،ص160۔

8. جیلانی بانو،''ایوانِ غزل''،ص۴۳۱،۵۳۱۔نئی دہلی،۱۹۷۶ء

9. جیلانی بانو،ایوان غزل،ص319۔

10. جیلانی بانو،ایوان غزل،ص126۔

11. ایوان غزل،ص78۔

12. جیلانی بانو،ایوان غزل،ص65۔

13. جیلانی بانو،ایوان غزل،ص68۔

14. بیٹی کی پیدائش اجر سے خالی نہیں۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک عورت آئی اور کھانے کیلئے کچھ مانگا اس عورت کے ہمراہ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ام المومنین کے پاس تین کھجوریں تھیں جو انہوں نے اس عورت کو دے دیں' اس نے ایک ایک کھجور اپنی بیٹیوں میں تقسیم کی اور ایک

خود کھانے کے ارادے سے منہ کے قریب لائی تو بیٹیوں نے اس کھجور کا مطالبہ کیا لہٰذا وہ بھی اپنی بیٹیوں میں تقسیم کر دی' یہ سب کچھ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ اتنے میں وہ عورت چلی گئی' کچھ دیر بعد آپؐ گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پورا واقعہ آپؐ کو سنایا تو نبی کریمؐ نے اپنی زبان نبوت سے ارشاد فرمایا کہ اُس عورت کا یہ طرزِ عمل اسے جنت میں لے جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس نے اپنی بیٹیوں کی اچھی تربیت کی تعلیم دلوائی پھر اچھے گھرانے میں ان کا رشتہ طے کیا' وہ جنت میں جائے گا پوچھا گیا جس کی دو بیٹیاں ہوں' آپؐ نے اس کیلئے بھی جنت کی بشارت دی' پوچھا گیا جس کی ایک بیٹی ہو تو نبی علیہ الصلوٰ والسلام نے اس کیلئے بھی وہی ارشاد فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا گھر میں کوئی چیز تقسیم کرو تو ابتداء لڑکی سے کرو۔ ذرا غور فکر کیجئے! جس کیلئے نبوت کی زبان سے اتنی بشارتیں۔۔۔۔ اس کو میں منحوس اور قابل نفرت سمجھنا اپنے گھٹیا ذہن اور کم فہمی کی علامت ہے۔ لہٰذا باشعور اور عقل مند انسان کا کام یہی ہے کہ بیٹی کی پیدائش کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت عظمیٰ سمجھے اور کسی قدم پر بیٹی کو بیٹے سے کم نہ سمجھے اور دونوں کے حقوق مساوی رکھے تو اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔

15. جیلانی بانو، ایوان غزل، ص100۔
16. ایوان غزل ص100۔
17. جیلانی بانو، (ایوان غزل، ص99۔95۔96۔
18. ایوان غزل ص328
19. ایوان غزل ص431
20. ایوان غزل۔ص178
21. ایوان غزل۔ص183
22. ایوان غزل ص32
23. ایوان غزل ص۔256
24. ایوان غزل۔ص302
25. ایوان غزل۔ص366
26. جیلانی بانو، ایوانِ غزل، ص182، ناولستان، نئی دہلی۔
27. رسالہ گفتگو، شمارہ نمبر 15۔16، ص278۔279، ستمبر تا دسمبر، بمبئی، 1976ء
28. جیلانی بانو، ایوان غزل، ص144، ناولستان، نئی دہلی، 1976ء
29. جیلانی بانو، ایوان غزل، ص144، ناولستان، نئی دہلی، 1976ء
30. جیلانی بانو ''ایوان غزل'' ص۳۰۱
31. جیلانی بانو ''ایوان غزل ص۲۳ ۔۳۳
32. مشرف علی، یلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ، ص61،
33. جیلانی بانو، ایوان غزل، ص420۔
34. عصمت چغتائی، رسالہ گفتگو، شمارہ نمبر 15-16، ص278۔279

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین
کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب
سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:
زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

سجاد احمد سلطان

مضمون

حامدی کاشمیری کی شعری خدمات

''وادی کشمیر میں اردو زبان وادب کے فروغ میں جن معتبر اور گراں قدر شخصیات نے اپنے خون جگر سے اس زبان کو سینچا اُن میں شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نویس، تنقید نگار، نثر نگار بطور خاص اہم ہیں۔ نیز ادبی انجمنیں کلچرل اکادمیاں، ریڑیو، ٹی وی اردو صحافت، جامعات اردو کے شعبہ جات، ادارہ اقبالیات کے علاوہ اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے اُدباء، قلم کار جو ظاہری طور ادب سے عدم وابستگی رکھتے ہیں لیکن اپنے وسیع علمی اور ادبی ذوق کی بدولت کارہائے نمایاں کام انجام دے چکے ہیں، نے اردو زبان کی ترقی وترویج میں ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ کشمیر سے باہر کے شاعروں اور مقتدر اساتذہ کرام کو بھی اس تناظر میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اردو زبان کے تاریخی پس منظر میں بات کی جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ زبان کشمیر میں فارسی کی تہزیبی لہر کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آئی کیونکہ سیاسی اقتدار اور مزہبی اعتقادات کے بسبب یہ کشمیریوں کی تہزیبی زندگی کا جزُ لائینفک بن گئی تھی ۔فارسی زبان گر چہ کشمیریوں کی اصلی زبان تو نہیں تھی مگر پانچ چھ صدیوں پر مشتمل ایک وسیع وعریض ادبی تاریخ اسی زبان میں محفوظ تھی۔ اس طویل مدت میں کشمیری زبان پر فارسی کا رنگ آنے لگا۔اس طرح اس زبان پر فارسی کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔کشمیری زبان پر فارسی زبان کا یہ اثر کشمیر میں اردو زبان کے لئے میدان تیار کرنے لگا۔اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں اردو فارسی کی تہزیبی پرورش کی زائیدہ ہے۔البتہ یہ زبان شہمیری دور تک ہی اپنا نفوذ واثر قائم رکھ سکی۔ایک نئی زبان اردو نے جنم لیا۔اس کے پھلنے پُھولنے کے لئے سازگار ماحول پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ یہاں کے لوگوں کا باہر کے لوگوں یعنی دہلی، پنجاب، لاہور کا وسیع پیمانے پر تجارت، سودا سلف اور دوسرے معاملات کے سلسلے میں خلط ملط ہوا۔اس زبان کا دائرہ کار وسیع تر ہونے لگا۔مسلمانو ں کا مزہبی سرمایہ اردو میں بہم ہونے لگا۔مدرسوں اور مکتبوں میں اردو کا بول بالا ہونے لگا۔ یہ تمام وجوہات ومحرکات اردو زبان کے فروغ میں کافی حد تک سودمند ثابت ہوئے۔اسی صورتحال سے متاثر ہو کر اُس وقت کے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاب سنگھ نے 1889ء میں اس سے سرکاری زبان کے باوقار اعزاز سے سرفراز کیا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے از بعید نہیں کہ ڈوگرہ دور میں اردو زبان جسمیں سرکاری زبان کا درجہ فارسی کو حاصل تھا، اپنا ایک مُثبت اثر قائم کر چکی تھی جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ڈوگری زبان کو سرکاری زبان بنانے کے جنون میں اردو کے مایہ ناز انشاپرداز مولوی محمد حسین آزاد سے ڈوگرہ حکومت کی تاریخ صفحہ قُرطاس پر قلمبند کرنے کی تمنا کی تھی ۔ دراصل مزکورہ حکمران محمد حسین آزاد کی کتاب دربار اکبری کے دل کش طرز تحریر سے خوب متاثر ہو چکے تھے اور ان کے سر پر اپنی زبان کی شُہرت کا بھُوت سوار ہو چکا تھا۔ چنانچہ مکاتیب آزاد میں رنبیر سنگھ کی اور سے اس پیشکش کا صاف اور واضح اشارہ ملتا ہے۔لیکن آزاد نے اس کو قطعی طور ٹھکرادیا۔اس کی تائید محمد یوسف ٹینگ نے کشمیر سے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری کی کتاب کشمیر میں اُردو کے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔

" آزاد کا کہنا ہے کہ میں نے یہ پیشکش ٹھکرادی کیونکہ بقول ان کے میری اپنی کتابیں نا تمام پڑی ہیں لوگو کہ میری جان اورں کی آنکھیں ان میں لگی ہیں۔میں کسی کی کتاب لکھوں۔طمع کا منہ

کالا۔"[۱]

گویا ایک طرف اُس وقت کے ڈوگرہ حکمران اس زبان کے دلکش طرز تحریر سے خوب مُتاثر تھے وہیں دوسری اور اردو زبان کی ترقی وترویج کے معاملے میں حالات نئی نئی کروٹیں بدل رہے تھے، جموں میں احمدی پریس کا قیام اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مزکورہ پریس میں قریب قریب تمام سرکاری دستاویزات کے فارم اردو میں چھپتے تھے۔ اس تناظر میں گربچن چندن کا یہ اقتباس پیش کرنا مناسب لگتا ہے۔

" اُن کے مطابق پہلا چھاپہ خانہ 1858 ء میں ڈوگرہ حکومت کے زیر اہتمام قائم ہوا۔ یہ پریس جسمیں فارسی اور دیوناگری حروف میں طباعت کا انتظام تھا، ریاست کی سرمائی راجدھانی جموں میں تھا۔ یہاں فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور دستاویزات چھپتے تھے[۲] اردو زبان میں چند سرکاری دستاویزات کی اشاعت اردو زبان کی ترقی کے لئے ایک پیش خیمہ ثابت ہوا، دوسری اور وکرم بلاس پریس کا قیام بھی سونے پہ سہاگا ثابت ہوا، جسمیں بدیا بلاس نام کا اردو ہندی کا مشترکہ اخبار چھپنا شروع ہوا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی کتابچہ "دبستان جموں کشمیر میں اردو" میں اردو زبان کی نشونما کے محرکات کے پس منظر میں ان خیالات کا بطور خاص اظہار کچھ یوں کیا ہے

" مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے دور میں 85 1857 چند غیر ملکی اور غیر ریاستی ماہرین کو بھی اس ریاست میں مختلف سرکاری شعبوں میں خصوصی کاموں کے لئے بُلایا۔ ان لوگوں نے اپنے ان سرکاری کاموں کے ساتھ ساتھ یہاں علم وادب کی بھی خاص خدمت کی۔ جن میں والٹر لارنس کی کتاب the valley of kashmir خاص قابل ذکر ہے۔ اسی طرح اتر پردیش کے ایک سرکاری حاکم حشمت نے بھی جموں کشمیر اور لداخ کے بارے میں ایک قابل قدر تاریخ اردو میں رقم کر ڈالی "۔[۳]

اس بات کا یہاں تزکرہ ضروری ہے کہ مزکورہ زبان کے پنپنے اور نشونما میں بہت سے عوامل ومحرکات کارفرما رہے ہے جن کا یہاں ہر ایک پر تزکرہ کرنا ممکن نہ صحیح ناممکن ضرور ہے۔ کیونکہ ایک تو مقالہ ضخیم بن جائے گا، دوسری بات یہاں اردو زبان کی تاریخ پر بحث مطلوب نہیں۔ اسکا سرسری جائزہ میں نے اس کے مختصر تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کے لئے کی ہے۔

جموں کشمیر میں اردو شاعری کا دفتر تفصیل کا متقاضی ہے ،جس کے لئے ایک وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اختصار سے کام لیا جائیگا۔ جموں کشمیر میں اردو شاعری کے ارتقا کے بارے میں بعض محققین نے گرچہ چندر بھان نامی شخص کے چند اشعار نمونے کے طور پیش کر کے اُن کو اردو کے پہلے شاعر کے طور گردانے کی کوشش کی ہے، تاہم دوسرے محققوں نے ان سے پوری طرح اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ اسلئے انہیں اردو کا پہلا شاعر تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی مایہ ناز کتاب کشمیر میں اردو اور چند دوسرے محققین نے میر کمال الدین اندرابی کا ذکر کشمیر کے پہلے شاعر کے طور پر کیا ہے۔ چنانچہ سروری صاحب لکھتے ہیں

" میر کمال الدین حسین اندرابی رسوا سے کشمیر میں اردو کے ترقی یافتہ روپ کا آغاز ہوتا ہے[۴]

اُن کے بعد مرزا عبدالغنی بیگ قبول، پنڑت دیا رام کاچرو خوشدل، زینب بی بی مجوب، سالک رام سالک، ہرگوپال خستہ، خوشی محمد ناظر، نندلعل کول، رسا جاودانی ، میرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکی، شہ زور کاشمیری، قیصر قلندر وغیرہ کو اردو کے اولین شعرا میں شمار کیا جاتا ہیں۔ اُن کے بعد جن شعرا کا ذکر آتا ہے، وہ 60 1955 کے بعد اردو شاعری کے منظر نامے پر

اُبھرتے ہیں اُن میں حامدی کشمیری، عابد مناوری، حکیم منظور، مظفر ایرج، فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب، شجاع سلطان، رفیق راز، اقبال فہیم، ہمدم کاشمیری، ایاز رسول نازکی، اشرف عادل، فرید پربتی، شفق سوپوری، نزیر آزاد، فاروق آفاق، پریمی رومانی، بشیر دادا، زاہد مختار، حسن انظر، مشتاق مہدی، رفیق انجم، شیخ خالد کرار، کے علاوہ شاعرات میں شہزادی کلثوم، سلما فردوس، عائشہ مستور، عابدہ احمد، نصرت چودھری، شفیقہ پروین، ستارہ نرگس، نسرین نقاش، رخسانہ جبین، ترنم ریاض، شبنم عشائی، پروین راجہ، صاحبہ شہریار، مدثر لالی، وغیرہ نے غزل کے فن کو پروان چڑھایا۔

حامدی کاشمیری کی شاعری کے حوالے سے میں اپنی بات خود اُن کے اُس بیان سے شروع کرتا ہوں، جو انہوں نے ایک گفتگو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہی تھی۔" شاعری میرا پہلا عشق ہے، تنقید کا رشوق ہے، جب تخلیق شعر پر طبیعت آمادہ نہ ہو، تو تنقید کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں، لوگ مجھے نقاد کی حیثیت سے تو مانتے ہیں، مگر شاعری کی طرف مطلوبہ توجہ نہیں دیتے۵ ۔

دوسری جگہ بھی وہ انہی خیالات کا اظہار کرتے ہے۔ " میری پہلی دلچسپی شاعری ہے "

(وادی امکان) پہلی بات

متزکرہ بالا بیانات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حامدی کشمیری شاعری کو پہلی دلچسپی مانتے ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ارباب ذوق علم وفن اس کی طرف عدم توجہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حالانکہ تخلیقی اعتبار سے اُن کا بیشتر سرمایہ شاعری کی صورت میں موجود ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ان کے شعری کے تخلیقی سرمایہ سے چنداں بحث کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔

حامدی کشمیری (۱۹۶۰) ء کے بعد اردو شاعری کے منظر نامے پر ایک تابندہ ستارے کی مانند اُبھرتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے کہکشاں کو اپنی شعری فضا سے چمکاتے ہیں۔ جدیدت کے علمبردار شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ پہلے کشمیری شاعر ہیں، جس نے جدیدت کے تحت شاعری کو پروان چڑھایا۔ اس میں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا۔ عصری مسائل کو بے باکانہ طور پر فنی چابکدستی کے ساتھ شعری پیکر میں پیش کیا۔ صحیح معنوں میں جدید شاعری کا بیج بو دیا۔ اس ضمن میں جناب منیب الرحمان کی یہ رائے کافی مستند قرار دی جاسکتی ہے کہ

" نئی شاعری یعنی جدید شاعری کے سلسلے میں، جس کی ابتدا (۱۹۶۰۶۵) ء کے بعد ہوئی، حامدی کشمیری نے کی۔ روایتی شاعری سے کنارہ کش ہوکر انہوں نے موضوع اور اسلوب کو بے جا جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے نئی شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ ریاست کی نئی اردو شاعری کے نمائندہ شعرا کی فہرست میں حامدی کشمیری سب سے آگے ہیں"۔ ۶

۔ حامدی کی شخصیت کے کئی روپ ہیں۔ وہ ایک محقق، نقاد، افسانہ نگار، ناول نگار، تبصرہ نگار، نثر نگار کے علاوہ ایک اعلا پایہ کے شاعر ہیں۔ کیونکہ شاعری سے انہیں فطری لگاو ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اسمیں متنوع وسنجیدہ خیالات کی مصوری کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ اب تک اُن کے آدھ درجن سے زائد شعری مجمو عے منصۂ شہود پر آچکے ہیں، جن میں عروس تمنا، نایافت، لاحرف، شاخ زعفران، وادی امکان، خواب رواں، یک شہر گماں بطور خاص ہیں۔ (۱۹۶۱) ء میں ان کے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت ہوئی۔ یہ وہ دور ہے جب وہ روایتی شاعری سے اپنی شعری کائنات کو سجاتے رہے، حسن وعشق کا بے ساختہ بیان، غم روزگار، مناظر فطرت کی عکاسی اس دور کی غزلوں میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ پندرہ سال بعد ان کے دوسرے شعری مجموعے نایافت کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس دور میں وہ پہلی روایتی شاعری سے ہٹ کر نئے تجربات اور احساسات کے تحت شاعری

کرنے لگے۔ (۱۹۸۴) اور (۱۹۹۱)ء میں لاحرف اور شاخ زعفران شعری مجموعے منظر عام پر آ گیے۔ جسمیں ان کی فنی پختگی اور فکر ونظر کی بلندی کا احساس صاف طور پر چھلکتا ہے۔ حامدی نے جہاں ایک فن کار کی طرح شاعری کو کثیر الجہتی میں تراشا وہی ادبی معیار کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی شاعری کو موضوعاتی تنوع بخشا جس سے ایک بڑے فن کار کا ثبوت پیش ہوتا ہے۔نئی نئی ترکیب واسالیب کو شاعری میں بروئے کار لایا۔روزمرہ اصطلاحوں،استعاروں،تشبیہوں کا استعمال کیا۔ جہاں بڑے بڑے فنکاروں نے اپنی ادبی تحریروں میں رومانیت بکھیر دی ہے۔ اس ضمن میں اگر حامدی کشمیری کا شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کیونکہ جب ان کی شاعری کا غائر مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں رومانیت کو برتا ہے اور ایسے دلکش اور پُر اثر تخیل کو زیر بحث لایا ہے جس سے رومانیت کے ساتھ ساتھ شعر کا جمالیاتی پہلو بھی آشکار ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحضہ ہو۔

آئی پہلو میں میرے قد کے برابر ہوگئی
دھوپ نکلی، برف پگھلی ،شعلہ منظر ہوگئی
وہ عبارت پہ تیری آگ بگولہ ہوگئی
کانپتے ہاتھوں میں پھر دست حنائی دے گئی

حامدی عام فہم بیانات پیش کرتے ہیں، جہاں بڑے بڑے شاعروں نے فلسفی وفکری موضوعات کو ادق الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرز میں زیادہ تر فارسی یا عربی کے الفاظ استعمال کرتے آئے ہیں جسے خالص اردو کے واسطہ بہت دور کا لگتا ہے۔لیکن یہ بڑی بات نہیں کہ ایک ادیب ادق الفاظ یا اصطلاحات کا استعمال کریں۔ جب ہم حامدی کشمیری کی شاعری کا مزاج دیکھتے ہیں تو فلسفی اور فکری موضوعات کو بھی عام فہم زبان میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔چنانچہ ان کی شاعری میں موضوعاتی تنوع ہیں ۔اور یہ تنوع نہ صرف فکر وفلسفہ سے تعبیر ہے بلکہ اس میں عشقی رنگت، جزباتی کیفیت، معاشی بدحالی ،سیاسی اُلجھن، قدروں کی پامالی، بے ثباتی دُنیا، تصوف بھرے خیالات غرض ہر طرح کے موضوعات کو جگہ ملتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ بھی اردو زبان کے سیدھے سادھے رنگ میں

حامدی دراصل غزل کے شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں نظموں کی بھی فراوانی ہے، گرچہ شدت ،تازگی، اور احساسات کی گرمی کا احساس کہیں موجود ہے۔لیکن پُر اثر علامتی اور تشبیہاتی نظام اور بیان کی تطہیریت ان میں شان امتیاز پیدا کر دیتی ہے ۔اس تناظر میں ان کے دوسرے شعری مجموعے میں نظم بعنوان یاسین کے طرز بیان سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اُکھڑتی سانسوں کی ضربوں سے
اس کا جسم نحیف
دیوار در ہلتے رہے
میں چومتا رہا اس کے زرد ہاتھوں کو
بیڑوں سے چمٹے ہوئے کالے استخوانی وجود
گلے میں دق زدہ چیخوں کو گاڑھتے ہی رہے
سکوت خوف کی پرچھائیوں کے ہاتھ بڑھے

حامدی صاحب کی شاعری کی انفرادیت ان کا جمالیاتی برتاؤ ہے۔وہ شعر میں جمالیاتی برتاؤ کے ساتھ ساتھ شعری تجربہ پر بھی زور دیتے ہیں، اس کی پُر زور وکالت کرتے ہیں۔وہ شعری تجربے کو دیکھے سمجھے بغیر ہی، شعر سے معنی اخذ کرنے یا موضوع تلاش کرنے کے خلاف ہے۔وہ مانتے ہیں کہ شعر کے لسانی نظام سے تجربے کی جو صورت نمود پزیر ہوتی ہے، پہلے اس کا تعین ضروری ہے۔قاری مطالعہ شعر سے پہلے پہل جمالیاتی طور پر لُطف اندوز ہونا چاہئیے ،بعد میں معنی تلاش کرے۔ یعنی شعر میں حامدی سب سے زیادہ زور جمالیات کی طرف دیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے

کہ قاری شعر کے جمالیاتی حظ سے لُطف اندوز ہوکر بعد میں اس سے کیا معنی پہنا دے۔ یہ اس کی ذہنی صلاحیت پر انحصار کرتا ہے۔ حامدی کی شاعری کی ایک اور خوبی ان کی تصویر کشی ہے۔ وہ شعر میں جمالیاتی برتاؤ کے علاوہ ایک تصویری فضا رقم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں جس کی مثال نیچے دئے گئے ان شعروں سے واضح ہو جاتی ہے۔

؎ لبوں کے سائے میں جلتے ہیں دشت کرب وبلا
کسی کی آنکھ میں عکس فرات ہو تو چلیں

؎ دریچے بند، ہوا برف، ہو کا عالم ہے
کہیں پہ ڈوبتے تاروں کا شور ماتم ہے

ان اشعار کے بصری پیکر سے جو صورت اُبھرتی ہے، جو منظر پیش ہوتا ہے، وہ شاعری میں محاکات کی اعلا مثال پیش کرتا ہے۔ حامدی صاحب اپنی شاعری میں ادبی صنعتوں سے گریز نہیں کرتے بلکہ انہیں فنی وقار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحضہ ہو۔

؎ رُت بہار جمال کی آئی کب گھڑی انتقال کی آئی
؎ یقین کا سلسلہ اوہام تک ہے تیرا جلوہ گلی سے بام تک ہے
؎ طوالت شب کی شائد کم بہت ہے چراغ دل کی لو برہم بہت ہے۔

ان اشعار میں جمال، انتقال، اوہام، بام، کم، برہم ذوالقافتین جیسی صنعت کے طور استعمال ہوئے ہیں۔ صنعت تکرار کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

؎ حرف در حرف ہو گئے چہرے حرف کاری کہ ساحری کی ہے
؎ کم ستم دیدہ نہ تھے اور ستم کیا کرتے شب کی روداد ہواؤں پہ رقم کیا کرتے

الغرض حامدی صاحب کی شاعری میں ان خصوصیات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ معنی خیز باتیں پُوشیدہ ہیں، جن پر میں بحث کرنے سے قاصر رہا۔ میرے مطالعے میں چند پہلو زیر بحث آئے جن کو میں نے اپنی علمی استعداد کے مطابق بیان کیا۔

حامدی کشمیری اردو زبان وادب کا ایک معتبر نام ہیں۔ جو بے پناہ تخلیقی جوہر کی بدولت عالمی شہرت یافتہ ادیبوں کی صف میں شمار کیا جارہا ہے۔ وادی گلپوش میں اردو زبان وادب پر ان کا بڑا احسان ہیں۔ کیونکہ یہ پچھلے پانچھ چھ دہائیوں سے کشمیر میں اردو زبان وادب کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اردو زبان وادب کی یہ عبقری شخصیت کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے ایک اہم وسیلے کے طور ثابت ہورہا ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱) کشمیر میں اردو، پروفیسر عبدالقادر سروری، سکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر۔، حصہ دوم، سنہ اشاعت (۱۹۸۲)، ص ۱۹ ۔

۲) بحوالہ روح ادب، گربچن چندن، ص ۵۹ ۔

۳) دبستان جموں کشمیر میں اردو، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سنہ اشاعت اول ۲۰۱۲ ص ۲۳

۴) بحوالہ کشمیر میں اردو ۴۷ء کے بعد، محمد یوسف خان عادل، اشاعت ۲۰۰۴ ص ۲۵

۵) شیرازہ (رسالہ)، حامدی کشمیری نمبر، جلد ۴۵، شمارہ (۴۷)، ص ۹ ۴۱ ۔

۶) نئی شاعری، از منیب الرحمان (تعمیر)، جموں کشمیر ادب نمبر، اگست ۱۹۸۳۔

صابر علی سیوانی

مطالعہ

ماہنامہ چہارسو (راولپنڈی) کا گوشۂ بیگ احساس

ہندوستان کے معاصر افسانہ نگاروں میں بیگ احساس ایک اہم افسانہ نگار شمار کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً سرزمین حیدرآباد کی نمائندگی کرنے والے افسانہ نگاروں میں انھیں نگاہِ اعتبار سے دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت حیدرآباد کے بڑے افسانہ نگاروں میں مظہر الزماں خاں اور پروفیسر بیگ احساس شمار کیے جاتے ہیں۔ برصغیر ہندو پاک میں ان دونوں ناموں کی گونج ہے۔ پاکستان سے جناب گلزار جاوید کی ادارت میں ماہنامہ ''چہارسو'' شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے مدیر اپنے ذاتی صرفے سے اس کی طباعت واشاعت عمل میں لاتے ہیں اور ہندو پاک کے سیکڑوں ادیب وشاعر کی خدمت میں ڈاک ٹکٹ چسپاں کر کے مفت میں بھیجتے ہیں۔ ''چہارسو'' کی خریداری کی رقم قارئین سے نہیں لی جاتی ہے اس لیے زرِسالانہ کے کالم میں ''دل مضطرب نگاہ شفیقانہ'' لکھا رہتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جناب گلزار جاوید کے دل میں اردو زبان وادب سے کتنی محبت اور جذباتی انسلاک ہے کہ وہ اپنی جیب خاص سے ہر ماہ اچھی خاصی رقم صرف کر کے کم و بیش سوا سو صفحات پر مشتمل اس وقیع رسالے کی اشاعت وترسیل عمل میں لاتے ہیں، جب کہ اہل اردو کا حال تو یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ رسائل مفت میں ان کے پتے پر ہر ماہ پہنچتے رہیں اور انھیں اعزازی خریدار کا رتبہ حاصل رہے۔ حالاں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اردو کے نام پر ہر ماہ کم وبیش ایک لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں۔ یہ جناب گلزار جاوید کے ہی دل گردے کی بات ہے کہ وہ اردو کی اتنی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ ایسے افراد اس دور میں عنقاء کے زمرے میں آتے ہیں۔ ماہنامہ ''چہارسو'' ہندو پاک کے نامور ادیبوں کا خصوصی گوشہ شائع کرتا ہے، جو کم وبیش پچاس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ علاوہ برایں دیگر مضامین، افسانے اور منظومات اس میں شامل ہوتے ہیں۔ دو سال قبل ''چہارسو'' نے ممتاز مزاح نگار پدم شری مجتبیٰ حسین کا گوشہ نکالا تھا جو کافی مقبول ہوا''۔ چہارسو مئی، جون ۲۰۱۸ء کا شمارہ معروف افسانہ نگار اور ناقد پروفیسر بیگ احساس کے خصوصی گوشے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

''چہارسو'' کے صفحہ نمبر 3 پر قرطاسِ اعزاز بیگ احساس کے نام والی عبارت مرقوم ہے۔ پچاس صفحات پر مشتمل گوشۂ بیگ احساس میں ''متاع چہارسو'' (ترتیب مضامین) عنوان کے زمرے میں سرِ ورق، پس ورق کی تزئیں وآرائش کرنے والے فنکار کا نام شعیب حیدر زیدی لکھا ہوا ہے۔ یہ اس رسالے کا خاصہ ہے کہ یہ سرور ق ڈیزائن کرنے والے اور پس ورق کی روپ ریکھا سنوارنے والے فنکاروں کے نام بھی شامل رسالہ کرتا ہے۔ تزئین اوراق کا فریضہ انجام دینے والی فنکار کا نام یہاں عظمیٰ رشید تحریر ہے۔ کمپوزنگ کرنے والے شخص کا اسم گرامی تنویر الحق ٹائپ کیا گیا ہے۔ بعد ازاں ''قرطاسِ اعزاز'' ذیلی سرخی کے تحت دس اہل قلم کے بیگ احساس کے فن وشخصیت کے حوالے سے مضامین شامل ہیں، جس میں محمد انعام الحق کا بیگ صاحب کے شناسنامے پر مشتمل دو صفحات میں تعارفی خاکہ ہے۔ بیگ احساس کا ایک تنقیدی وتحقیقی مضمون قرۃ العین حیدر کے شاہکار ناول ''آگ کا دریا'' پر شامل ہے۔ گلزار جاوید نے ''براہِ راست'' (انٹرویو)، کے ذیل میں بیگ احساس کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بھرپور اور دلچسپ تحریر پیش کی ہے۔ ''بیگ احساس تم ہی ہو'' سے مجتبیٰ حسین اور بیگ احساس کے افسانے'' کے زیر عنوان وارث علوی کے مضامین ہیں۔ افسانہ نگاری کی انوکھی تدبیر (مرزا حامد بیگ) جنوں کا سوداگر (سرور الہدیٰ) افسانوی رمز (رضوانہ پروین) نئے افسانے کی بیانات (ڈاکٹر مولا بخش) جیسے عنوانات پر مشتمل دلچسپ تحریروں

کے علاوہ آخر میں بیگ احساس کا شاہکار افسانہ ''دخمہ'' گوشۂ بیگ احساس کی زینت ہیں۔مضمون نگاروں کے اسمائے گرامی سے ہی اس گوشے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جب روایت چہار سو نمبر ۴ اور ۵ پر بیگ احساس کا توقیت نامہ شامل کیا ہے، جو سرمئی شیام کا اجالا جیسے خوبصورت عنوان پر محتوی ہے۔ یہاں بیگ احساس کی زندگی کی پوری جھلک ایک سرسری نظر دیکھی جاسکتی ہے۔ان کا اسم گرامی سے لے کر ان کی تعلیم تدریس انعامات واعزازات، مطبوعات اور مختلف اداروں سے ان کی وابستگی کی پوری تفصیل ہے۔ان کے فن اور شخصیت پر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں اور جو ہو رہے ہیں، اس کی اطلاع بھی دی گئی ہے۔صفحہ ۶ سے ۱۰ تک بیگ احساس کا لکھا ہوا قرۃ العین حیدر کے مقبول ترین ناول ''آگ کا دریا'' پر بھرپور تحقیقی وتنقیدی مضمون قارئین ''چہار سو'' کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون مذکورہ ناول کی تفہیم کی راہوں کو آسان بناتا ہے۔ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے دوسرے معاون مواد سے استفادہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور معاون مواد کے طور یہاں بیگ احساس کا مضمون ہماری بہترین رہبری کرتا ہے۔ بیگ احساس کا مضمون ''آگ کا دریا'' عنوان سے ہی اس رسالے میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے شعور کی رو کی تکنیک کے حوالے سے بڑی دلچسپ گفتگو کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے جب ناول لکھا تو ان کے سامنے انگریزی ادیبوں کی اس طرح کی تخلیقات ضرور رہی ہوں گی۔انھوں نے خاص طور پر ورجینا وولف کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ عام طور پر عینی آپا پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے آگ کا دریا لکھتے وقت ورجینا وولف کے ناول Ornaldo سے اثرات ضرور قبول کیے ہیں۔اس سلسلے میں بیگ احساس کی عبارت پر نظر ڈالتے ہیں:

> ''تکنیکی اعتبار سے قرۃ العین حیدر کے جس ناول کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی وہ ''آگ کا دریا'' ہے۔اس ناول پر یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ورجینیا وولف کے ناول Ornaldo سے تاثر قبول کیا ہے۔ جب کہ قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا 1989ء کے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کی کہ انھوں نے ورجینیا وولف کا ناول Ornaldo ''آگ کا دریا'' لکھنے کے بعد پڑھا حقیقت جو بھی ہو قرۃ العین حیدر نے ''وقت'' کے ساتھ جو تجربہ کیا ہے وہ اردو ناول نگاری میں پہلی کامیاب کوشش ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس ناول سے تیس پینتیس برس قبل عالمی ادب میں ''وقت'' پر عظیم ناول لکھے جا چکے تھے۔شعور کی رو کی بے شمار تجربے کیے جا چکے تھے۔ تجربہ کرنے والوں میں برداش، کونراڈ، ہنری جیمس، جیمس جوائس، ڈورتھی رچرڈسن، ورجینیا وولف، اور ولیم ولکز وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے بعد Michael Butor، Serin، Gertude، Robe-Gillet تھالی سروت نے نئے تجربے کیے اور ناول کے روایتی انداز کو توڑا۔ان ناول نگاروں نے ''وقت'' کے ساتھ جو ناول کی ساخت میں تبدیلی کی اس کا سرچشمہ برگساں ہے''۔(صفحہ 6)

پروفیسر بیگ احساس کی اس دلیل میں صداقت بھی دکھا کی دیتی ہے کہ عینی آپا کے ناول سے قبل انگریزی کے متعدد تخلیق کاوں نے ''وقت'' کے ساتھ تجربہ کیا تھا اور اس تجربہ کو قرۃ العین حیدر نے اردو میں پہلی بات ''آگ کا دریا'' میں بروئے کار لایا۔ دوسری بات یہ کہ چوں کہ عینی آپا انگریزی ادب کی ماہر تھیں۔اس زبان پر انھیں زبردست ملکہ حاصل تھا۔اس لیے قرینِ قیاس یہ ہے کہ انھوں نے ''آگ کا دریا'' لکھنے سے قبل مذکورہ انگریزی مصنفین کی تخلیقات اور ان کے ناول ضرور پڑھے ہوں گے۔خیر یہ تو

تحقیق کا موضوع ہے اور تقابلی مطالعہ کے ذریعہ اس صداقت تک محققین پہنچ سکتے ہیں لیکن بیگ احساس نے یہاں جس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قابل غور ہے اور لائق توجہ بھی۔ حالاں کہ بیگ صاحب اپنے ایک اسکالر سے ورجینیا وولف اور قرۃ العین حیدر کے تقابلی مطالعے پر کام کرایا تھا، دونوں میں کافی مماثلت پائی گئی اس بات کا اظہار انھوں نے اسی رسالے کے براہِ راست انٹرویو میں کیا ہے۔ یہاں گلزار جاوید نے بیگ احساس سے یہ سوال کیا کہ ''بہ طور نقاد آپ قرۃ العین حیدر کے اس بیان کو کس نظریے سے دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ورجینیا وولف کا ناول ''آگ کا دریا'' کے بعد پڑھا؟ اس سوال کے جواب میں بیگ صاحب کہتے ہیں ''مجھے ان کی بات تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ میں نے اپنی ایک اسکالر (جوانگریزی کی بھی ایم اے تھی) سے ورجینیا وولف اور قرۃ العین حیدر کے تقابلی مطالعے پر کام کروایا۔ دونوں میں بے پناہ مماثلت ہے۔ حتیٰ کہ بعض اقتباسات تک حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے ہیں''۔ (چہارسو، 16)

''براہِ راست'' کے زیرعنوان مدیر چہارسو نے بیگ احساس سے کافی طویل انٹرویو لیا ہے جو چالیس سوالات پر مشتمل ہے اور رسالے کے چھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سوالات کے انداز بالکل انوکھے ہوتے ہیں جو عام مصاحبہ کاروں کے سوالات سے بالکل مختلف اور کسی حد تک مخاطب کو الجھا کر رکھ دینے والے سوالات ہوتے ہیں۔ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں، جن میں فنکار کی کمیوں کی جانب اشارہ ہوتا ہے اور اس سے اس کی وضاحت چاہی جاتی ہے۔ کچھ سوالات اس طرح کے ہوتے ہیں جس کے جواب سے قارئین فن کار کی اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتے ہیں، جس سے برسوں تک ناواقف رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''براہ راست'' کے ضمن میں یہ سوال کہ آپ کے مزاج میں وہ کونسا عنصر ہے جس کے باعث آپ کے افسانوں کا اختتام جزنیہ ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب ملاحظہ کیجئے ''بچپن میں یتیم ہو جانا خواہشات کا سہم جانا لوگوں کے سات نیکی اور اچھا سلوک کرنے کے بعد ان کا پلٹ کر وار کرنا۔ بہت سے ساتھیوں کی اچانک موت شاید یہی عناصر ہیں'' (صفحہ 5)

یہاں بیگ احساس اس بات کی مختصراً ہی سہی وضاحت کر دیتے کہ جب آٹھ سال کی عمر میں وہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تو ان کی تعلیم کا سلسلہ کیسے جاری رہا؟ کس نے رہنمائی کی اور کس رشتہ دار نے تعلیمی راہیں ہموار کرنے کی ذمہ داری کی۔ اس سے دوسرے ایسے طلبہ کو حوصلہ ملتا ہے کہ نامساعد حالات میں بھی تعلیمی سلسلہ جاری رکھ کر اس مقام تک پہنچا جا سکتا ہے کہ ملک کا باوقار سرکاری ادارہ اس فنکار کو ''ساہتیہ اکادمی انعام'' سے نوازنے کے لیے مجبور ہو جائے۔ یہاں دوسری بات یہ لکھنی ہے کہ جن بہت سے ساتھیوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے، جو اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے اگر ان کے نام بھی گنوا دیئے ہوتے تو قارئین کو ان ساتھیوں کا علم ہو جاتا کہ جن سے ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ گلزار جاوید نے بیگ احساس کی بیشتر کہانیوں کو پڑھا ہے۔ کم و بیش ہر اہم کہانی کے حوالے سے انھوں نے سوالات کیے ہیں۔ ان کے سوالات کے جوابات بیگ صاحب نے نہایت تشفی بخش انداز میں دیے ہیں۔ بیگ احساس کے ایک افسانہ ''خسِ آتش سوار'' کے متعلق گلزار جاوید پوچھتے ہیں کہ ''خس آتش سوار'' کے گرودیو سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی اور گرودیو نے آپ کو کھینچ تان کر انتظار حسین کے ''زرد کتّا'' کے قریب کیوں کر کر دیا''؟ یہ سوال ہی بتاتا ہے کہ جاوید صاحب افسانے کے کردار اور اس کے مماثل دوسرے افسانہ نگاروں کے افسانوں کے کرداروں سے کتنی اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بیگ احساس کا کہنا ہے کہ ''گرودیو دراصل یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ میں نے صرف ماحول کو تبدیل کر دیا سارے کردار جیتے جاگتے ہیں۔ اس میں ''زرد کتّا'' بالکل نہیں ہے۔ انتظار حسین کا ''زرد کتّا'' طمع دنیا کی علامت ہے جو تین دن فاقے سے مجبور ہو کر

ایک لقمہ حرام کھاتے ہی زندگی بھر کے لیے ساتھ ہو گیا ساری زندگی ''وہ'' کشمکش میں مبتلا رہا اور اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا ''خسِ آتش سوار'' میں تو ''وہ'' بھگوان سے بغاوت کر کے آشرم چھوڑ دیتا ہے۔وہ سیدھے سادے انسان کی زندگی جینا چاہتا ہے۔''(صفحہ 14)

نامور مزاح نگار پدم شری مجتبیٰ حسین کی ایک تحریر دل پذیر رسالے کے صفحہ نمبر 17 پر موجود ہے۔ یہ تین صفحات کا مضمون ہے۔ دراصل بیگ احساس پر لکھا ہوا ایک خاکہ ہے جس میں مزاح نگار نے پردے ہی پردے میں اردو کی زبوں حالی، نئی نسل کی اردو کے عام الفاظ سے ناواقفیت، پروفیسروں خصوصاً اردو کے پروفیسروں کی زبان و بیان کی نزاکتوں سے عدم واقفیت پر بھر بھر کے تیر برسائے ہیں۔ ساتھ ہی ضمناً یونیورسٹی آف حیدرآباد میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر اپنے دو سالہ معیاد کے دوران اپنی مقبولیت اور تجربے کا ذکر کیا ہے۔ بیگ احساس کی وجاہت، سلیقہ شعاری، خوش پوشا کی اور ان کی نپی تلی گفتگو کے حوالے سے دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ بیگ احساس کے چہرے پر ہمیشہ تر و تازگی رہتی ہے اور وہ ہر وقت دیدہ زیبی والے لباس میں ملبوس رہتے ہیں۔ان کی اس نفاست پسندی، خوش سلیقگی کے حوالے سے مجتبیٰ حسین نے جو پتے کی بات کہی ہے، اس سے آپ بھی لطف اندوز ہونے کی کوشش کیجیے۔

''پچھلے دنوں ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بیگ احساس کس چکّی کا پسا ہوا آٹا کھاتے ہیں کہ ہر دم تر و تازہ اور چاق و چوبند دکھائی دیتے ہیں؟ اس پر میں نے کہا تھا، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ آئے کے ساتھ تھوڑی سی چکی بھی ضرور کھا لیتے ہیں اور یوں بھی ان کا ہاضمہ اور حافظہ دونوں غضب کے ہیں'' دلچسپ بات یہ ہے کہ بیگ احساس اپنے آپ کو جوان برقرار رکھنے یا ظاہر کرنے کی خاطر کسی ایسے بھاری بھرکم میک اپ کو بھی اختیار کرنے کے قائل نہیں ہیں جس سے گزر کر آدمی کم کم اور جوکر زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے بالوں کو بڑے جتن کے ساتھ خضاب سے رنگتے ہیں''۔ آگے چل کر وہ بیگ احساس کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''میری شخصی رائے ہے کہ عصر حاضر کے اگر پانچ بڑے افسانہ نگاروں کی کوئی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں بیگ احساس کا نام ضرور شامل رہے گا۔ وہ محقق اور نقاد تو ہیں ہی، فن افسانہ نگاری میں بڑی اہم، معتبر، اور مستند شناخت رکھتے ہیں۔ وہ نہایت مخلص سچے اور ایماندار افسانہ نگار ہیں۔ چنانچہ وہ اپنا ہر افسانہ نہایت ڈوب کر لکھتے ہیں۔ نہ صرف افسانہ میں ڈوب جاتے ہیں بلکہ افسانہ کے کرداروں میں ڈوبنے کے علاوہ افسانہ کی جزئیات اور اس کے پلاٹ میں بھی ڈوب جاتے ہیں۔ تاہم اپنے قاری پر اتنا کرم کرتے ہیں کہ وہ ڈوبنے نہ پائے''۔(صفحہ 18)

پروفیسر بیگ احساس عہد حاضر کے ان افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے کسی ادبی تحریک سے رشتہ جوڑے بغیر اپنی الگ شناخت قائم کی۔ ان کی انفرادیت کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے دوسرے معاصرانہ افسانہ نگاروں کی طرح زود نویسی سے کام لیے بغیر لکھنے اور اہم لکھنے کو ہی زیادہ بہتر تصور کیا اور اسی اصول پر کاربند رہتے ہوئے جو کچھ بھی لکھا وہ انفراد و امتیاز کے خانے میں رکھا گیا۔ عصر حاضر کے سلگتے ہوئے موضوعات پر انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت صرف کرتے ہوئے شاہکار افسانے لکھے انھوں نے جو کچھ بھی لکھا بہت سوچ سمجھ کر اور مہینوں غور و فکر کے بعد لکھا۔ ان کے افسانوی خوبیوں میں ایک اختصار نویسی ہے، جو قاری کو کسی الجھاؤ کا شکار بنائے بغیر مفہوم کی ترسیل کے قریب لاتا ہے۔ وارث علوی کا تنقیدی مضمون صفحہ نمبر 20 پر شامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بیگ احساس کی فنی خوبیوں اور مختصر جملوں کے ذریعے افسانے کے تانے بانے بُننے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے درست بات کہی ہے۔ انھوں نے بیگ احساس کے متعدد افسانوں کے حوالے سے لکھا ہے:

''بیگ احساس کے ان افسانوں کی ایک صفت یہ

ہے کہ وہ مختصر ہیں۔ مختصر اس معنی میں نہیں جیسا کہ مختصر، مختصر افسانہ ہوتا ہے اور جس کی نمایندہ مثالیں ہمارے یہاں رتن سنگھ اور عبد العزیز خان کے افسانے ہیں۔ لیکن بیگ احساس کے تازہ افسانے دس بارہ صفحات سے زیادہ کے نہیں۔ یہ اختصار مواد کی کمی یا واقعات اور جزئیات سے احتراز یا بیانیہ میں عجز کے سبب نہیں، کیوں کہ جہاں ایسا ہوتا ہے وہاں افسانہ عجلت نویسی کی زائیدہ تشنگی کا احساس چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس بیگ احساس کا افسانہ بھرپور ہوتا ہے۔ اور سیرابی کا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں اختصار اجمال کا حسن رکھتا ہے۔ ان کے یہاں ایک واقعہ، ایک جملہ اور ایک لفظ بھی بھرتی کا نہیں ملے گا۔ ان کے ایجاز اور منٹو کے ایجاز میں بڑی مماثلت ہے۔ لیکن اعجاز کا یہ سبق انھوں نے منٹو سے سیکھا ہو ایسا نہیں لگتا۔ کیوں کہ سبق سیکھنے کے لیے کم از کم افسانے کے کینوس میں مماثلت ہونا ضروری ہے۔ بیگ احساس کا افسانہ خود اپنا ہے۔ اس پر ان کی انفرادیت کی چھاپ بھی ہے اور اس کے موضوعات مسائل اور پس منظر اس دور کا عطیہ ہیں جس میں ان کا شعور پروان چڑھا ہے اور جو منٹو، بیدی اور عصمت کے دور سے مختلف ہے۔ بیگ احساس کی انگلیوں کے نیچے ان کے زمانے کی نبض دھڑکتی ہے''۔ (صفحہ 20)

وارث علوی صاحب نے بیگ احساس کے افسانوں کی جزئیات اور ان افسانوں میں موجود فنی باریکیوں کو بڑی باریکی سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''میں اپنی اس رائے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں کہ جتنے مختصر جملے بیگ احساس لکھتے ہیں، اس کی کوئی مثال اردو کے افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملے گی۔ انکا ہر جملہ پانچ سات لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسا یا تو زبان کا مبتدی کرسکتا ہے یا استاد جو سہل ممتنع پر قادر ہو۔ بیگ احساس کی زبان میں برجستگی ہے، سادگی ہے، اور تازگی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر وہ ایسے پیچیدہ مسائل واقعات اور سچویشن کا ذکر کرتے ہیں جو زبان کی زیادہ پیچیدہ شکل کا متقاضی ہوتا ہے، لیکن بیگ احساس بڑی خود اعتمادی سے ان مرحلوں سے گزر جاتے ہیں اور اپنی زبان و بیان کے ایجاز و اختصار اور سادگی پر آنچ آنے نہیں دیتے''۔ (صفحہ 20)

''چہارسو'' کے کم وبیش 9 صفحات پر محیط مرزا حامد بیگ کی تنقیدی تحریر ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے بیگ احساس کے کم وبیش تمام افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کا یہ مضمون بیگ احساس کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ افسانوں مجموعہ ''دخمہ'' میں بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں بیگ احساس کے افسانوں دخمہ، رنگ کا سایہ، کھائی، سنگ گران، نمی دانم، سنگ گراں، دھار، سانسوں کے درمیاں، نجات، چکرویو، درد کے خیمے، شکستہ پر، وغیرہ پر یکے بعد دیگرے بھرپور تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ ان افسانوں کی جزئیات سے بحث کی ہے۔ ان میں موجود زبان و بیان کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ توجہ ''دخمہ'' پر دی ہے اس افسانے پر دوسرے افسانوں کے مقابلے زیادہ سطریں لکھی ہیں۔ یہ افسانہ چوں کہ پارسیوں کی تہذیب اور ان کے طرز زندگی اور موت کے بعد ان کی نعشوں کو ایک اونچی مخصوص طرز کی بنی ہوئی عمارت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ گدھ آکر ان کی نعشوں کو اپنی خوراک کا حصہ بنا سکیں۔ ایک پارسی کردار

سہراب کی موت کے تناظر میں یہ افسانہ اس کی زندگی اور موت کے بعد پیدا ہونے والے متعدد سوالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مرزا حامد بیگ ''دخمہ'' کے تعلق جورائے قایم کرتے ہیں اسے ملاحظہ کیجئے:

''دخمہ'' گوتھی (Gothic) طرز تعمیر کا افسانہ ہے جس میں عقائد، رسومات، روایات، تاریخ، سیاست اور انسانی روابط کے متعلقات کی محرابیں ایک دوجے میں پیوست ہیں۔ اس افسانے میں جس فراست کے ساتھ حیدرآباد میں ملوکیت کے خلاف چلنے والی کمیونسٹوں کی تلنگانہ تحریک اور آزادی 1947ء کے بعد پولیس ایکشن، نیز زبان کی بنیاد پر ریاستی حد بندیوں کا حوالہ دیکھنے کو ملتا ہے، اس طرح تو ابراہیم جلیس کی لانگ فکشن ''دو ملک ایک کہانی'' میں بھی دیکھنے کو نہ ملا''۔ (صفحہ 25)

یہاں مرزا حامد بیگ نے افسانہ ''دخمہ'' سے ماخوذ متعدد اقتباسات کے ذریعے اس افسانے کے سیاق و سباق کی جانب اشارہ کیا ہے اور جس پس منظر میں یہ افسانہ لکھا گیا اس کی تمام پرتیں کھولنے کو کوشش کی ہے۔ دیگر افسانوں کے تعلق سے جو تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے اس تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ بیگ احساس نے جس زبان و بیان کا استعمال اپنے مذکورہ افسانوں میں کیا اس کے تعلق ے جو کچھ مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے اسے ملاحظہ کیجئے:

''اب آیے زبان و بیان کی طرف اس کے باوجود کہ بیشتر افسانوں میں تاریخ، سیاست، مذہب، معیشت اور معاشرت زیر بحث ہے۔ پھر بھی خالصتاً علمی موضوعات سے مخصوص سپاٹ دوٹوک زبان کہیں دیکھنے کو ملتی جو Information بہم پہنچانے کا لازمہ ہے۔ بیگ احساس نے کہیں کہیں بولی ٹھولی کی سطح پر حیدرآبادی رنگ بھی برتا ہے اور سنسکرت اور ہندی بھی لیکن صرف مکالموں کی سطح پر، راوی کے بیانیہ میں نہیں۔ زبان و بیان سے متعلق یہ وہ شعور ہے، جس سے ہندوستان اور پاکستان میں لکھا جانے والا بیشتر حالیہ افسانہ خالی دکھائی دیتا ہے..... ایک مدت بعد مجھے ان افسانوں میں اتنی نتھری ستھری زبان پڑھنے کو ملی جو نہ تو اردو کا لکھنوی رنگ ہے نہ دہلوی، لیکن کیا کہنے صاحب! اب وہ زمانہ گزر گیا جب راشد الخیری، اشرف صبوحی، صادق الخیری اور آمنہ نازلی نے اپنے افسانوں میں اردوئے معلیٰ کی خوشبو بسالی تھی۔ اب تو دلی میں بھی کرخنداری کا چلن ہے''۔ (صفحہ 32)

''چہارسو'' کے اس خصوصی گوشے میں مرزا حامد بیگ کی تحریر کے بعد سرور الہدیٰ (جنوں کا سودا)، رضوانہ پروین (افسانوں کا افسانوی رمز) اور ڈاکٹر مولیٰ بخش (نئے افسانے کی بیانیات) کے معلوماتی مضامین کے علاوہ آخر میں بیگ احساس کا اہم ترین افسانہ ''دخمہ'' کا متن بھی شامل ہے۔ مذکورہ قلم کاروں نے بیگ احساس کی تخلیقی ہنرمندی سے بحث کی ہے اور ان کے افسانوں کی خوبیوں، تکنیک اور کرداروں کے حوالے سے پُر اثر معلومات پر بحث کی ہے جو بیگ شناسی میں ہماری رہبری کرتی ہے۔ گلزار جاوید نے جس خصوبصورتی اور سلیقے سے بیگ احساس کا یہ خصوصی گوشہ ترتیب دیا ہے اور اسے نذر قارئین کیا ہے، اس کے لیے وہ بیحد مبارک کے مستحق ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ آمین!

☆☆☆

جو وہ لکھیں گے جواب میں

پروفیسر بیگ احساس صاحب_____السلام علیکم!

آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا عالمی و ادبی رسالہ سب رس ابھی ابھی ڈاکیہ سے موصول ہوا۔ آپ کا پُر مغز اداریہ پڑھ کر بہت سی تاریخی یادیں تازہ ہوگئیں۔ آپ نے جس نینی تال کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کا Summer Resort رہا ہے۔ نہرو نینی تال کی پر فریب پہاڑیوں میں گم ہو جایا کرتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا جمالیاتی پہلو تھا۔

نہرو نے اسی پولیس آفیسر گگن دیپ سنگھ کی طرح اردو کے مشہور ادیب و صحافی خواجہ احمد عباس کی والدہ اور بہنوں کو فسادیوں سے بچالیا تھا۔ نہرو نے ایک خصوصی فوجی جیپ دہلی سے پانی پت بھیجی اور عباس کی فیملی کو دہلی لے آئے۔ دہلی سے ہوائی جہاز کے ذریعہ ممبئی روانہ کر دیا۔ مہاتما گاندھی نے 1947ء کے بھیانک فسادات میں سینکڑوں مسلمانوں کو نواکھالی میں موت کے منہ میں جانے سے بچایا تھا۔ باپو جی 15/اگست کی صبح آزادی میں دہلی میں ہونے والی پرچم کشائی کی سرکاری تقریب میں موجود نہیں تھے۔ وہ ننگے پاؤں برہنہ سر نواکھالی کی گلیوں میں یہ بھجن گاتے پھر رہے تھے۔

رگھو پتی راگھو راجہ رام
پتت پاون سیتا رام
ایشور اللہ تورے نام
سب کو سن متی دے بھگوان

وہ دکھیاروں کو مالک حقیقی کی یاد دلا رہے تھے۔ ان کے زخموں کو مندمل کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ اس سابرمتی کے سنت کو بنی نوع انسان کی سلامتی کی فکر لاحق تھی۔ اردو کے معروف شاعر کنور مہندر سنگھ سحر بیدی نے دہلی کے Administrative Officer کی حیثیت کئی مسلم خاندانوں کا تحفظ کیا۔ مجموعی طور پر ہندوستان کے رہنے والے امن و شانتی کے پجاری ہیں۔ مٹھی بھر لوگ ہندو مسلم دشمنی کی آگ میں شب و روز جلتے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ آپ ایسے ہی اداریے رقم کرتے چلے جائیں۔ پاکی داماں کی حکایت بیان کرتے جائیں۔ آپ کا ذہن آپ کی نظر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک نقرئی لکیر ہے۔ آپ پر شاعر انقلاب مخدوم محی الدین کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

اس اندھیرے میں اک رو پہلی لکیر
ایک آواز حق نبی کی طرح

علی احمد فاطمی کا مختلف ناولوں کے بارے میں تجزیاتی مطالعہ وقیع و عالمانہ ہے۔ ان کا قلم گوہر آبدار ہی اگلتا ہے۔ موریامہ ٹاکیرو کا مضمون منٹو اور تقسیم ہند بہت اچھا اور پیارا مضمون ہے۔ انہوں نے منٹو کی نفسیاتی پرتوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ منٹو کے کی افسانوں کا جائزہ خوبصورتی کے ساتھ لیا ہے۔ انہیں میری جانب سے مبارکباد۔ سعیدہ بانو احمد کی سوانح عمری ڈگر سے ہٹ کر قصہ پارینہ نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ انہوں نے بھوپال کے اشرافیہ طبقہ کی عورتوں کی Lesbianism کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ شاید آنے والے وقتوں میں اس پر روشنی ڈالی ہوگی۔ یہ ان کا Bold Approach ہوگا۔ عارف خورشید کا افسانہ کاغذی پیرہن عمدہ ہے اس کی زبان جدید ہے۔ میاں بیوی کی لاثانی حبت کی موثر

عکاسی کی گئی ہے۔ میں تو افسانے کی فضا میں کھو گیا تھا۔ افسانے کا کلائمکس انوکھا اور چونکا دینے والا ہے۔ عارف خورشید کی تحریر میں تازگی، جدت طرازی، رسیلا پن اور بلا کی کشش ہے۔ ان کی تحریر اورنگ آبادی نہیں لاہوری، دہلوی، لکھنوی لگتی ہے۔ عارف کے قلم میں سحر انگریزی اور اعجاز کی لہریں موجزن ہیں۔ وہ ہمارے عہد کے صف اول کے تخلیق کار ہیں۔

سب رس کے آخری ٹائٹل پیج پر ہندوستان کے آخری ویسرائے مونٹ بیٹن اور ان کی بیوی ایڈوینا کی تصویر چھپی ہے نیچے لکھا گیا ہے کہ انہیں دہلی میں دربار منعقد کرنے کا اختیار تھا۔ لیکن ماونٹ بیٹن نے دہلی میں کوئی دربار بھی منعقد نہیں کیا۔ انگریزوں کے دوسو سالہ دور میں صرف تین دفعہ دہلی میں دربار منعقد کیا گیا۔ پہلا دربار 1877، دوسرا 1902 اور تیسرا 1911 میں منعقد ہوا۔ ریاست حیدرآباد کے چھٹے فرمانروا میر محبوب علی پاشاہ نے 1903ء کے دہلی دربار Imperial Darbar میں شرکت کی تھی۔ جب ویسرائے لارڈ کرزن نے ان کے گلے میں ہار پہنانے کوشش کی تو محبوب علی پاشاہ نے اپنی تلوار آگے کر دی اور اپنی تیغ بے نیام کو ہار پہنانے کے لیے کہا۔ محبوب علی پاشاہ کے لیے دہلی دربار ایک تلخ ترین تجربہ تھا۔ اسی لیے وہ دسمبر 1911ء کے دہلی دربار میں جانے کے لیے پس وپیش کر رہے تھے۔ دہلی جانے کی سرکاری تیاریاں تو چل رہی تھیں مگر نواب صاحب دہلی کے سفر پر مائل نہیں تھے۔ وہ فلک نما پیلس میں تھے۔ اچانک آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ نے جان دے دی لیکن دہلی دربار نہیں گئے۔ آپ دہلی دربار میں شرکت کو اپنی بادشاہت کی توہین سمجھتے تھے۔ آپ کو ویسرائے کے آگے دست بستہ حاضر ہونا بہت بُرا لگتا تھا۔ ان تمام رسومات کو اپنے رتبہ سے کم تصور کرتے تھے۔ رحلت کے وقت آپ کی عمر 42 سال کی تھی۔ حیدرآباد کے آسمان نے غم وحوشی کا یہ منظر بھی دیکھا۔ ایک جانب سے جلوس جنازہ آرہا تھا اور دوسری طرف سے نئے فرماں روا میر عثمان علی خاں کا جلوس تخت نشینی آرہا تھا۔ اُفق پر ایک آفتاب غروب ہو رہا تھا تو اسی اُفق سے ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ روشنی کا تسلسل جاری تھا۔ ٹائٹل پیج کی تصویر میں ماونٹ بیٹن کے ساتھ اس کی وائف ایڈینا کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ خاتون اتنی سیدھی سادھی نہیں تھی جتنی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ رنگین مزاج عورت تھی۔ اس کے کئی معاشقے تھے۔ یہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر اپنے عاشق کے ساتھ سفر پر چلی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نہرو سے اس کے تعلقات تھے۔ دونوں کے رومانس کو کرشنا سوبتی سنگھ نے اپنی کتاب Through the windows of Anand Bhavan میں لکھا ہے۔ ماونٹ بیٹن کو اپنی بیوی کی عاشقی کا پتہ تھا۔ اپنی بیوی کے Extra Marital Relations کو ماونٹ بیٹن اور پوری فیملی قبول کر چکی تھی۔ ایڈینا کی بیٹی پامیلا نے اپنی کتاب Daughter of Empire Life Asa Mountbatten میں لکھا ہے کہا اس کی ماں آدم خور Man Eater تھی اس کے سارے عاشق اس بچی کے انکل تھے۔ نہرو نے اسی دوستی سے فائدہ اٹھا کر سیاسی فائدہ ماونٹ بیٹن سے حاصل کیا۔ تقسیم ہند کے پہلے اصل نقشہ میں پورا بنگال، آسام، سلہٹ، پاکستان میں شامل تھے۔ نہرو نے اسے آدھی رات کو دیکھ کر مسترد کر دیا اور ماونٹ بیٹن سے ضد کی کہ وہ اسے تبدیل کر کے نیا نقشہ بنوایا جائے۔ ماونٹ بیٹن نے سکریٹری مینن کو پاکستان کے نقشے سے آسام، سیالہٹ کو نکال دینے کا حکم دیا ان کے ساتھ بنگال کو ہندوستان میں رکھا گیا۔ صبح جب کانگریس، مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس ہوا اور اس میں ماونٹ بیٹن نے تقسیم ہند کا نقشہ ٹیبل پر رکھا تو جناح اسے دیکھ کر سرد ہو گئے انہوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا تو ماونٹ بیٹن نے ان سے کہا کہ اس کا ہوائی جہاز برطانیہ کی پرواز کے لیے تیار کھڑا ہے۔ وہ اس نقشہ کو لے کر برطانیہ

جا رہا ہے۔ وہاں اسے منظوری مل جائے گی۔ جناح کے سامنے اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے بادل ناخواستہ اس پر دستخط ثبت کر دیئے۔ البتہ جناح نے ایک جملہ کہا جو تاریخ میں ریکارڈ ہو چکا ہے۔ مجھے Mouth Eaten یعنی کٹا پھٹا پاکستان دیا گیا ہے۔ اقبالؔ کا شعر فضاؤں میں کہیں دور لہرا رہا تھا۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

ڈاکٹر مسعود جعفری۔ ٹولی چوکی، حیدرآباد

برادرم بیگ احساس صاحب ــــــ آداب و نیاز!

سب رس کا مئی کا شمارہ ملا، شکریہ! زیر نظر شمارے کے اداریئے بعنوان ''جمہوریت پر فاشزم کے سائے'' نے بر سر مطالعہ دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ آخر ہمارا موقف حقوق کس دوراہے پر آ کھڑا ہے۔ بقول آپ کے ملک کے چاروں سمت انار کی عصبیت، زعفرانی سیاست، بھگوا اقتدار کے زرد سائے پوری آب و تاب کے ساتھ منڈ لا رہے ہیں۔ اقلیت کا ایک تہائی طبقہ غیر محفوظ حالات کا شکار ہے۔ جس کے تانے بانے آپ نے سارے واقعات اپنے ارادیئے میں کھول کر رکھ دیئے ہیں جنہیں دہرانا یا ان پر تبصرہ کرنا تضیع اوقات ہے یعنی راقم کی اتنی اوقات نہیں ہے آپ کے سُلگتے ہوئے اداریئے پر من و عن تبصرہ کروں۔ اداریئے کے آخر میں آپ نے اردو ادب کی دو بڑی شخصیتیں حضرت فضیل جعفری اور ستار صدیقی کے انتقال کی ناگہانی خبر سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ فضیل جعفری عظیم نقاد و دانشور و شاعر و مدیر کے علاوہ ثقافت اور سماج کی ایک عہد ساز شخصیت کے مالک بھی تھے۔ جناب ستار صدیقی جن سے راقم کا دیرینہ ذہنی اور فکری رشتہ رہا ہے۔ موصوف کے قول کے مطابق ان کے چالیس سال کی عمر میں وہ ملکہ شاعری سے ہم پہلوئے ادب لوہا منوایا۔ موصوف کا ایک شعر ان کے منفرد لب و لہجہ کی یاد دلاتا ہے۔

بلندی سے کہیں تم گر نہ جاؤ
وہیں ٹھہرے رہو میں آ رہا ہوں

علیم صبا نویدی۔ چینائی

مکرمی!

سب رس جون2018ء میں آپ کا اداریہ ایک ایسے واقعے کو پیش کرتا ہے جس سے قومی یکجہتی کی توقعات مضبوط ہوتی ہے۔ ہندوستان کی اکثریت مل جھل کر رہنا چاہتی ہے۔ بھیڑ کے تشدد کی جو لہر اس وقت چل رہی ہے اگر فرض شناس پولیس اس کو روکنا چاہے تو روک سکتی ہے یہ بات انسپکٹر گگن دیپ سنگھ نے ثابت کر دکھائی۔ مضامین سارے معیاری ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اردو ناول پر ایک بے لاگ مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے کسی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا یہ بات سچ ہے کہ اب تک کوئی ایسا ناول منظر عام پر نہیں آیا جسے غیر معمولی اور معیاری سمجھا جائے۔ صرف ملک کی ترقی پسندی بعض موقعوں پر بے وجہ لگتی ہے۔ ڈاکٹر وسیم بیگم نے علی جواد زیدی کو یاد کیا۔ جنھیں ہم نے تقریباً بھلا دیا اسی طرح شفیق فاطمہ شعریٰ کے کلام کا تجزیہ پسند آیا۔ مورماٹا کیرو کا مضمون گو پرانے موضوع پر ہے لیکن انھوں نے بعض نئے انکشافات کیے ہیں۔ محبوب بی شیخ نے غالباً پہلی بار اردو اور تلگو افسانوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ سعیدہ بانو احمد کی آپ بیتی دلچسپ ہے اور اس دور کے بھوپال کو پیش کیا۔ جہاں خواتین کی حکومت کی وجہ سے بیشتر برائیاں در آئیں تھیں۔ سعیدہ بانو احمد نے کہیں اپنی حدیں پار نہیں کیں اور خوب صورت انداز میں اس معاشرہ پر طنز کیا۔ عارف خورشید اور طیبہ خاں کے افسانے اچھے ہیں۔

ناہید سلطانہ۔ حیدرآباد

بیگ احساس

8-1-398/PM/416, Yaser Enclave

Flat No. 401 Paramount Hills, Tolichowki

Hyderabad - 500 008

بی بی رضا خاتون

Assistant Professor, Department of Urdu

MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500 032

سجاد احمد سلطان

Assistant Professor, Head Dept of Urdu

Govt. Degree College for Boys

Anantnag (Jammu&Kashmir) 192 101

جاں نثار معین

Research Scholar, Dept of Women Education

MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500 032

نورالحسنین

1-12-31, Pragati Colony, Ghati,

Aurangabad 431 001

محمد یحییٰ جمیل

Baitul Jalil, Plot No. 9, Aseer Colony, Post VMV,

AMRAVATI-444604

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

مشتاق احمد یوسفی (1923 - 2018)

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-07 July, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے موقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطی، یو کے، یو ایس اے اور کینڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

... اردو حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے لاکھوں تک رسائی حاصل کرکے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24613379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Tachaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469